امیر خسرو

فرد اور تاریخ

معین الدین عقیل

امیر خسرو

فرد اور تاریخ

معین الدین عقیل

ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان
کراچی

ضابطہ

تصنیف	:	امیر خسرو: فرد اور تاریخ
مصنف	:	ڈاکٹر معین الدین عقیل
ناشر	:	ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پاکستان ۔ کراچی
طابع	:	المخزن پرنٹرز، پاکستان چوک، کراچی
کتابت	:	بقا کمپوزنگ سروسز، اردو بازار، کراچی
اشاعت	:	۱۹۹۷ء (اول)
قیمت	:	...... روپے

ملنے کے پتا

مکتبۂ شاہد

۹/۱، علی گڑھ کالونی

کراچی ۷۵۸۰۰

محبِ مکرم

پروفیسر ڈاکٹر

ابو سلمان شاہ جہان پوری صاحب

کی نذر

پرسوز و نظر باز و نکوبین و کم آزار
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند

معروضہ

یہ کتاب ان مقالات پر مشتمل ہے، جو قریباً بیس برس قبل تحریر کیے گئے تھے۔۔ اس عرصے میں امیر خسرو اور بالخصوص ان کے عہد پر بنیادی ماخذ اور تحقیقی مطالعات پر مبنی عمدہ کتابوں کا ایک انبار ہے، جو ملک و بیرون ملک منظر عام پر آیا ہے۔ اس کے باوجود کہ اب ان مقالات میں متعدد مقامات پر ترمیم و اضافے کی خاصی گنجائش موجود ہے اور کہیں کہیں تکرار بھی نظر آتی ہے، یہاں انھیں ۔۔۔ کسی ترمیم و اضافے کے بغیر۔۔۔ بعینہٖ پیش کیا جا رہا ہے۔

عقیل

ٹوکیو، فروری ۱۹۹۷ء

مندرجات

اساتذہء خسرو

امیر خسرو کے والد سیف الدین محمود شمس الدین التتمش کے عہدِ حکومت (۱۲۱۱ء - ۱۲۳۶ء) میں کش سے، جو ماوراء النہر کا ایک قدیم اور مشہور شہر ہے، ہندوستان آئے تھے (۱)۔ یہاں وہ التتمش کے دربارِ شاہی کے امراء میں منسلک ہو گئے اور انھوں نے اپنی قابلیتوں اور خوش اخلاقی کی بدولت بلند مراتب حاصل کیے۔ ان کو پٹیالی میں ایک جاگیر بھی عطا ہوئی تھی (۲) اور بارہ ہزار تنکہ سالانہ وظیفہ ملتا تھا (۳)۔ وہ یہیں سکونت پذیر ہو گئے اور اس زمانے کے شاہی دربار کے ایک معزز امیر عماد الملک کی صاحبزادی سے عقد کیا، جن کے بطن سے ۱۲۵۳ء میں امیر خسرو پیدا ہوئے۔

خسرو نے اپنے والد کو ان کے نام کے ساتھ "امیر" اور "سیف شمسی" لکھا ہے (۴)۔ وہ اپنی بہادری کے لیے مشہور تھے (۵)۔ خسرو نے ان کی امارت کے ساتھ ساتھ ان کی خدا ترسی کی بھی تعریف کی ہے (۶)۔ ان کے والد نے تعلیم حاصل نہیں کی تھی (۷) لیکن اپنے لڑکوں کو شوق سے تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ امیر خسرو نے ہوش سنبھالا تو تعلیم کے لیے مکتب میں بٹھا دیے گئے۔ جب وہ آٹھ سال کے ہوئے تو ان کے والد ایک معرکے میں شہید ہوئے (۸)۔ ان کی شہادت کے بعد وہ اپنے نانا عماد الملک کی نگرانی اور سرپرستی میں آ گئے۔

یہ سرپرستی ان کے لیے فال نیک ثابت ہوئی (۹)۔ عماد الملک سلطنت کے
ممتاز امراء میں تھے۔ التتمش کے عہد سے غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶ء۔۱۲۸۷ء)
کے عہد تک "عرض ممالک" کے عہدے پر فائز رہے (۱۰)۔ بلبن کے دور میں
عماد الملک کا شمار سلطنت کے چار بڑے ستونوں میں ہوتا تھا (۱۱)۔ ان کے
دربار کے تمام آداب اور لوازمات بڑے بڑے امراء اور بادشاہوں کے دربار
ہی کی طرح تھے۔ اس میں علماء، شعراء اور اربابِ نشاط سب ہی شریک رہتے
(۱۲)۔ اسی امارت و ثروت سے ماموں ماحول میں امیر خسرو کی پرورش ہوئی۔
ان محفلوں میں خسرو کو علم و ادب اور موسیقی کے ذوق کی نشو و نما میں بڑی مدد
ملی اور ان کی تعلیم و تربیت، جو ان کے والد کی بے وقت وفات سے ممکن تھا
کہ ناقص اور نامکمل رہ جاتی، برابر جاری رہی۔ خسرو نے ان تمام علوم و فنون
میں، جو ان کے زمانے میں رائج تھے، اتنی دسترس حاصل کر لی تھی کہ انھیں
کبھی اپنی کم علمی کی وجہ سے شرمندگی کا موقع پیش نہیں آیا (۱۳)۔ آگے چل کر
ان میں جو علمی استعداد پیدا ہو گئی تھی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مذہب،
تصوف، فقہ، علم نجوم، ہیئت اور صرف و نحو پر غیر معمولی درک رکھتے تھے۔ عربی
پر بھی ان کی نظر گہری تھی۔ وہ ہندی بھی بول سکتے تھے (۱۴) اور ہندی کے
بھی بڑے شاعر سمجھے گئے۔

خسرو نے اپنے درسی علوم کی تحصیل کی بابت صرف اپنے دیباچہ
"تحفۃ الصغر" میں مختصر طور پر ذکر کیا ہے۔ ان کے والد کی عین خواہش تھی کہ
خسرو "بے حاصل" کچھ حاصل کریں (۱۵)۔ وہ جب سن تمیز کو پہنچے تو مکتب میں

داخل کر دیے گئے اور ساتھ ہی کچھ علماء گھر پر تدریس کے لیے مقرر کیے گئے (۱۶)
لیکن اب ان علماء کے بارے میں کچھ معلومات ہنیں ملتیں۔ خسرو نے اس دور
کے اپنے صرف ایک استاد خواجہ سعدالدین محمد کا ذکر کیا ہے، جنھیں "قاضی"
کہا جاتا تھا۔ وہ انھیں خطاطی سکھاتے تھے (۱۷)۔ اس سے زیادہ کچھ علم ہنیں کہ
وہ ایک ماہر خطاط تھے، جیسا کہ ان کی یہ صفت خسرو کے اس شعر سے ظاہر ہوتی
ہے:

گیسوئے تو ہم چو خط خواجہ است کہ دردی
آساں نتواند کہ ہند ہر لپسر انگشت (۱۸)

قاضی سعدالدین کے نام کے ساتھ لفظ "قاضی" ظاہر کرتا ہے کہ وہ
خطاطی کے علاوہ دیگر علوم میں بھی درک رکھتے تھے۔ خسرو اپنے دیباچہ "تحفۃ
الصغر" میں لکھتے ہیں کہ ان کے استاد ان کو خطاطی سکھانے میں ان کی پیٹھ پر
درے لگاتے، لیکن ان کے سر پر زلفِ پیچاں کا سودا ایسا سمایا ہوا تھا کہ وہ لکھنے
پڑھنے کی طرف کم مائل رہے۔ اور شعر گوئی کی دھن میں جو کچھ موزوں ناموزوں
کہہ لیتے تھے، اسی کی مشق وصلیوں پر کیا کرتے تھے (۱۹)۔ اسی دیوان کے دیباچہ
میں اپنے بچپن کے جو بعض دل چسپ حالات لکھے ہیں، ان سے یہ ظاہر ہوتا
ہے کہ شاعری کا مادہ ان میں پیدائشی تھا اور بہت کم سنی میں وہ ایسی آسانی سے
شعر موزوں کر لیتے تھے کہ سننے والے تعجب کرتے (۲۰)۔ ایک دوسری جگہ
"دیباچہ دیوان غرۃ الکمال" میں بھی لکھتے ہیں کہ "میرے دودھ کے دانت بھی
ہنیں ٹوٹے تھے کہ میں نے شعر گوئی کی ابتدا کی" (۲۱)۔ اسی دوران وہ اپنے استاد

قاضی سعدالدین کے توسط سے قاضی عزالدین سے متعارف ہو چکے تھے، جو اس وقت علم و فضل میں بڑی شہرت رکھتے تھے ۔ قاضی عزالدین نے خسرو کی استعداد کو دیکھ کر انھیں "سلطانی شمسی" کی مناسبت سے "سلطانی" تخلص رکھنے کا مشورہ دیا (۲۲)۔ خسرو نے وقتی طور پر ان کا یہ مشورہ قبول کر لیا تھا، چناں چہ "دیوان تحفۃ الصغر" کی متعدد غزلوں میں یہی تخلص ملتا ہے (۲۳)۔

بارہ سال کی عمر میں خسرو میں اتنی غیر معمولی قابلیت پیدا ہو گئی تھی کہ فارسی شاعری کے استاد مثلاً انوری، خاقانی اور سنائی وغیرہ کے کلام کا مطالعہ کر سکتے تھے ۔ پھر اسی صغر سنی میں ان اساتذہ کے فن کے تتبع میں شعر بھی کہنے شروع کر دیے تھے (۲۴)۔ سولہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے خسرو نے شاعری میں اچھی خاصی مہارت پیدا کر لی تھی اور اس زمانے میں ان کے اشعار کچھ ایسے مقبول ہوئے کہ گویے مجلسوں میں گانے لگے اور جن کو سن کر بڑے بوڑھے وجد کرتے تھے (۲۵)۔ پھر وہ جب بیس ہی سال کے تھے تو ایک دیوان "تحفۃ الصغر" کے نام سے مرتب کر لیا، جس میں تقریباً پینتیس قصیدے، پانچ ترکیبِ بند، کچھ متفرقات اور ایک مثنوی ہے ۔

شاعری میں ابتداً خسرو نے اپنی غیر معمولی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر کسی کو اپنا استاد نہیں بنایا تھا ۔ شروع میں بطورِ خود کہتے رہے پھر کسی استاد سے مشورہ لینے کے بجائے اساتذہ کے دواوین کو سامنے رکھ کر ان کا تتبع کیا کرتے، لیکن بالآخر وہ اپنا کلام اساتذہ کو دکھانے لگے (۲۶)۔ اپنی مثنوی "ہشت بہشت" کے خاتمے میں وضاحت کی ہے کہ یہ کتاب مولانا شہاب الدین مہمرہ کی اصلاح

یافتہ ہے۔ پہلے مولانا شہاب الدین مہمرہ کی تعریف کی ہے، پھر لکھتے ہیں:

من بدو عرض کردہ نامہ خویش
او بہ اصلاح راند خامہء خویش

دید ہر نکتہ را رقم بہ رقم
رنج برخود نہاد و منّت ہم

نظرے تیز کرد و موئے شگاف
نے بہ عمیا نظارہ بگذاف

ایں دقائق کہ شد زمغزش پوست
موبمو شعر بیز کردہ اوست

شمع من یافتہ ضیا از دے
مس من گشتہ کیمیا از وے

ہرچہ او گفت من نہادم گوش
ہرکشیدم مگس زشربت نوش

وانچہ بنمود ومن نہ جستم پے
عیب آں برمن است نہ بروے

یارب او چوں زیخ نامہ من
برد بیروں خطائے خامہ من

نامہء او کہ حرز جانش باد
درقیامت خط امانش باد

آخری شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچوں مثنویاں مولانا شہاب الدین مہمرہ کی اصلاح کردہ ہیں۔

مولانا شہاب الدین مہمرہ بدایوں کے رہنے والے تھے۔ان کے والد کا نام جمال الدین تھا، جو خود بھی مہمرہ کہلاتے تھے(۲۷)۔امیر خسرو نے ان کے بارے میں جابجا اپنے جو تاثرات ظاہر کیے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ایک بلند پایہ شاعر بلکہ اپنے عہد کے بہت بڑے عالم و فاضل بھی تھے۔ ان کی قابلیت پر خسرو کی شہادت بھی موجود ہے:

در بداواں مست برخیزد شہاب مہمرہ
بشنود از نغمہ مرغانِ دہلی گر نوا (۲۸)

مولانا شہاب الدین اپنی فلسفہ دانی اور حکمت کی وجہ سے "بقراط وقت" اور "افلاطون زمانہ" کہلاتے تھے۔الہیات، طبیعات، ریاضیات، معقولات اور منقولات سب میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ فقہ میں "بسوط" اور حکمت میں "اشارات" پر بڑا عبور تھا۔ ان کے بارے میں خسرو اپنی مثنوی "ہشت بہشت" میں لکھتے ہیں:

چرخ چوں راست کرد دستارش
بست عزالی بہر تارش
گر کند سوئے آں عمامہ نظر
مشتری رافتد عمامہ زسر

حکمتش داد از بس افزونی
ملک بقراطی و فلاطونی
در الٰہی فنش نہ در حد کس
حد او ہم الہ و اندوبس
در طبیعی شناختہ بتمم
واز مولود عنصر و اجرم
در ریاضی بیک حریر قلم
باز کرد دست گوش جذر اصم
عقلیش از قیاس عقل بروں
نقلیش از مقام نقل فزوں
درّۂ بسوط دربکے مستتش
صد اشارات در ہرا نکشتتش
ہر چہ در دہر نقش دانائی ست
دل او را بران توانائی ست
اوجو ابرِ کرم بغرق جہاں
زیرکاں چوں صدت کشادہ دہاں (۲۹)

امیر خسرو نے "دیوان غرۃ الکمال" کے دیباچے میں مولانا شہاب الدین مہمرہ کو "سلیمان ملک سخن" کہا ہے (۳۰) جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فن شاعری میں بھی شہاب مہمرہ کو کمال حاصل تھا۔ لوگ ان کے کلام کو دیوانہ وار

سنتے تھے، لیکن انھوں نے اپنے کلام کو مدون نہیں کیا (۳۱)۔ "ہشت بہشت" میں مولانا شہاب کی شاعری کی ہنایت تعریف میں ان کو عربی زبان کے مشہور شعراء بحتری اور ابو تمام سے افضل قرار دیا ہے اور یہ کہ ان کے اشعار خانہ کعبہ کے بجائے بہشت میں آویزاں کیے جانے کے لائق ہیں:

او شہاب و دل و تتش زاخیار
نیّرینِ مشارق الانوار
از تمام فنون و فضل تمام
غیرت بحتری و بوتمام
گاہ تحریر گر بہ بیت عتیق
یافتِ اشعار تازیاں تعلیق
شعر او را کہ مطلع نورست
جائے تعلیق بیت معمور است

ایک روایت کے مطابق شہاب مہمرہ کو رکن الدین فیروز شاہ کے عہد (۱۲۳۶ء) میں ملک الشعراء کا خطاب ملا تھا (۳۲)۔ اپنے علمی وادبی محاسن کی وجہ سے مولانا شہاب الدین اپنے عہد کے غالباً تمام شعراء کے استاد تھے۔ اسی لیے محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ نے عہد علائی کے شعراء کی فہرست میں انھیں شہاب الدین صدر نشین کا لقب دیا ہے (۳۳)۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے ان کو "شہسوار میدان بلاغت" اور "استاد الشعراء" لکھا ہے (۳۴)۔ اس عہد کا مشہور اور ممتاز شاعر ملک الکلام فخر الملک عمید تولکی، جو خسرو اور حسن سجزی کا

سرپرست بھی رہا، شہاب الدین مہمرہ کو استاد کے لقب سے یاد کرتا ہے (۳۵)۔
"سلک السلوک" اور "طوطی نامہ" کے نامور مؤلف مولانا ضیا الدین نخشبی
بھی ان کے شاگردوں میں سے تھے (۳۶)۔ شہاب مہمرہ نے اپنا کلام مرتب
نہیں کیا، گو ان کا منتشر اور متفرق کلام ہر زمانے میں شوق سے پڑھا گیا۔
گیارھویں صدی ہجری میں تقی اوحدی مؤلفِ "عرفات العاشقین" نے ان کے
تقریباً سات سو بکھرے ہوئے اشعار جمع کیے۔ اور اس کا یہ بھی بیان ہے کہ
اس کے عہد میں بھی تمام اربابِ نظر مولانا شہاب الدین مہمرہ کو اساتذہ فن
میں شمار کرتے تھے (۳۷)۔

خسرو نے نہ صرف شاعرانہ انداز میں مولانا شہاب الدین کے ادبی و
علمی کمالات کی مدح سرائی کی ہے بلکہ جس طرح انھوں نے خاقانی، انوری،
سنائی، ظہیر فاریابی اور کمال اصفہانی کی پیروی میں قصائد لکھے، اسی طرح مولانا
شہاب کی تقلید میں بھی قصیدہ کہہ کر ان کو اساتذہ فن میں شمار کیا ہے اور خود
جب سخنوری کے شباب پر پہنچے تو اپنا کلام اصلاح کے لیے مولانا شہاب کو
دکھانے لگے۔ جیسا کہ پہلے درج کیا گیا ہے کہ اپنی مشہور و معروف مثنوی "ہشت
بہشت" کے خاتمے میں خسرو نے اعتراف کیا ہے کہ یہ کتاب مولانا شہاب
الدین کی اصلاح شدہ ہے۔ ان کا بیان ہے کہ مولانا شہاب نے دشمن بن کر
اس مثنوی کی غلطیاں دیکھیں، گو دوستوں کی طرح اس کو پسند بھی کیا:

گرچہ چوں دوستاں پسندیدہ
لیکن از چشم دشمناں دیدہ

دیدۂ خصم عیب کوش بود
دیدۂ دوست عیب پوش بود
دید چوں دشمناں دریں دفتر
تاہمہ عیب آمدش بہ نظر
چوں ہمہ عیب دید دشمن وار
مشت چوں دوستانِ آئینہ وار
کلک او تیر راست رابگماشت
کہ دریں روضہ آہوئے نگذاشت

خسرو مولانا شہاب کی بتائی ہوئی غلطیوں کو ادب سے قبول بھی کرتے تھے:

ہرچہ او گفت من ہنادم گوش
برکشیدم مگس زشربت نوش

ان اشعار کی بنا پر مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ خسرو نرے مقلد نہ تھے۔ جہاں ان کو اصلاح کی وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی، وہاں استاد کی رائے بھی تسلیم نہیں کرتے تھے، گو ادب کا پاس اب بھی ملحوظ رکھتے (۳۸):

وانچہ بنمود من نجستم پے
عیب آں برمن است نہ بروے

اس مثنوی کے آخری اشعار میں خسرو نے مولانا شہاب کا شکریہ ادا کیا ہے:

صد ہزار آفریں برآں دل چاک
که بروں بروزیں چمن خاشاک

انچہ او وید تانہایت دید
خس و خارے زگلشنے برچید

انچہ ماندار نظر بہ پردہ نہاں
ہم نہاں داروش خدائے جہاں

یارب او چوں زیخ نامہء من
بردہ بیروں خطائے خامہء من

نامہء او کہ حرز جانش باد
در قیامت خط امانش باد

انھیں پڑھ کر یہ کہنے میں تامل نہیں کہ خود خسرو نے مولانا شہاب کو
اپنا مشفق استاد تسلیم کیا ہے۔ وہ غالباً اپنا کلام مستقل طور پر ان ہی کو دکھاتے
رہے ہوں گے۔ اسی وجہ سے کہا:

شمع من یافتہ ضیا از وے
مس من گشتہ کیمیا از وے

ڈاکٹر وحید مرزا نے اپنے فاضلانہ تحقیقی مقالے میں مولانا شہاب
الدین مہرہ کو امیر خسرو کا استاد تسلیم نہیں کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اپنی بعض
تصانیف میں وہ ایک ہم عصر عالم شہاب الدین کا ضرور ذکر کرتے ہیں کہ ان
سے بعض نظموں میں انہیں اصلاح ملی، لیکن یہ بزرگ کون تھے، یہ کہنا مشکل

ہے (۳۹)۔ پھر بعد میں فاضل محقق نے شہاب الدین مہمرہ کی بحیثیت استادِ امیر خسرو تردید کی ہے (۴۰)۔ لیکن دیباچے میں لکھا ہے کہ خسرو نے شہاب الدین مہمرہ کی تقلید میں بھی بعض قصائد کہے (۴۱)اور پھر یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ ایک شاعر شہاب الدین سے متعدد بار امیر خسرو نے شاعری کے متعلق مشورہ بھی کیا (۴۲)، اور پھر یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ شہاب الدین سے خسرو نے "ہشت بہشت" پر نظر ثانی کرائی (۴۳)۔ اسی شہاب الدین کو خسرو کا سرپرست بھی تسلیم کیا ہے (۴۴)لیکن پھر بھی جس شہاب الدین کا ذکر بار بار آیا ہے، وہ انھیں شہاب الدین مہمرہ اور امیر خسرو کا استاد تسلیم نہیں کرتے، جب کہ اس دور میں اپنی علمیت اور شعری و فنی محاسن کے اعتبار سے کوئی اور شہاب الدین اس پائے کا کہ جس سے خسرو، حسن سجزی، عمید تولکی، ضیاء الدین نخشبی جیسے بزرگ علماء اور شعرا مستفیض ہوتے رہے ہوں، موجود نہیں تھے۔ خود امیر خسرو نے شہاب الدین مہمرہ کے علم و فضل کا جو اعتراف کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا شہاب الدین مہمرہ اپنے علمی و ادبی مرتبے کی وجہ سے اس عہد کے غالباً تمام شعراء کے استاد تھے۔ اسی لیے فرشتہ نے اس عہد کے شعراء کی فہرست میں ان کو "صدر نشین" اور ملا عبدالقادر بدایونی نے ان کو "استاد الشعراء" لکھا ہے۔ بعد میں مولانا شبلی اور دیگر مصنفین نے بھی انھیں امیر خسرو کا استاد تسلیم کیا ہے۔

بعض مصنفین کی جانب سے مولانا شمس دبیر کا ذکر بھی امیر خسرو کے استاد کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ شمس دبیر کا پورا نام شمس الدین اور سنام ان کا

وطن تھا (۴۵)۔ خواجہ امیر حسن سجزی، جو امیر خسرو کے قریبی دوست، شیخ نظام الدین اولیاء کے مرید اور ان کے ملفوظات "فوائد الفواد" کے مرتب تھے، مولانا شمس الدین کو اپنا قریبی عزیز اور ہم قوم بتاتے تھے (۴۶)۔ حسن سجزی کی روایت ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے علم سلوک پر قاضی حمید الدین ناگوری کی کتاب، "لوائح" بابا فرید گنج شکر سے پڑھی تھی (۴۷)۔ اس اعتبار سے بابا فرید ان کے استاد اور غالباً مرشد بھی تھے (۴۸)۔ ان کی علمی استعداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ہر قسم کے علوم حاصل کیے تھے۔ مولانا سید عبدالحئی نے ان کا شمار ممتاز علماء اور شعراء میں کیا ہے (۴۹)۔ سلاطین دہلی کے دربار سے منسلک ہوئے تو "دبیر" کے فرائض انجام دیتے رہے (۵۰)۔ چناں چہ شمس دبیری کے نام سے معروف ہوئے۔

شمس دبیر اپنے وقت کے قادر الکلام اور ممتاز شاعر تھے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے ان کا ذکر سلطان ناصر الدین محمود کے عہد میں کیا ہے اور ان کو عہدِ ناصری کا ملک الکلام قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ ان کے فضائل و کمالات حدِ بیان اور تعریف سے مستثنیٰ ہیں (۵۱)۔ شمس دبیر خسرو کو دوست رکھتے اور ان کی قربت کو پسند کرتے تھے۔ خسرو کی جدائی انھیں شاق گزرتی تھی (۵۲)۔ ایک موقعے پر انھوں نے خسرو کو اپنا ایک دیوان عطا کیا تھا (۵۳)۔ خسرو بھی انھیں اپنا مربی اور سرپرست سمجھتے تھے اور ان کی سخن سنجی اور سخن فہمی کے برابر معترف رہے۔ وہ مولانا شمس دبیر اور قاضی اثیر (۵۴) کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان دونوں کی حیثیت بڑے سیاروں یعنی زہرہ اور مشتری کی تھی

اور وہ محض عطارد کی طرح وہاں موجود تھے۔ (۵۵) خسرو مولانا شمس دبیر کو عقیدت اور احترام کا درجہ دیتے تھے۔ صغر سنی ہی میں ایک قصیدہ ان کی مدح میں لکھا تھا۔ اس کے دو شعر یہ ہیں:

سپہر عزو علا شمسِ دیں ودل کہ گشت
میاں سبنلہ فضلی بسر و دانہ حنش
بچرخ آئینہ وش عکس روئے روشن اوست
کہ کردہ اند خطاب آفتاب تیغ زنش

ان کی مدح میں بعد میں بھی کئی قصائد لکھے۔ ایک قصیدے میں لکھتے ہیں:

شمس دیں مردمک چشم خرد کز دل او
فضل را قیمت ومقدار بروں آوردند
اے دبیرے کہ بہ پروانہ نوک تست
تیغ خورشید زرنگار بروں آوردند
گرہ کلک ترا اہل سخن بکشادند
زاں ہمہ لولوے شہوار بروں آوردند
نافہء مشک زخلق تو بکہار خرند ہوں
مو گرفتند زکہسار بروں آوردند

"دیباچہ دیوان غرۃ الکمال" میں بھی خسرو نے شمس دبیر کی مدح کی ہے (۵۶)، جس پر شمس دبیر کو بھی فخر تھا (۵۷)۔ لیکن ملا عبدالقادر بدایونی نے لکھا

ہے کہ امیر خسرو نے دیباچہ "دیوان غرۃ الکمال" اور مثنوی "ہشت بہشت" کے خاتمے پر شمس الدین دبیر کی خوبیوں کا ذکر اور ان کے اوصاف کا اظہار کیا ہے (۵۸)۔ اول الذکر تصنیف کا حوالہ تو درست ہے، لیکن "ہشت بہشت" کے تعلق سے اس کا خیال صحیح نہیں۔ اس مثنوی کے آخر میں شمس دبیر کا نہیں بلکہ مولانا شہاب الدین مہمرہ کا ذکر ہے، جس کا حوالہ پہلے دیا جاچکا ہے۔ عبدالقادر بدایونی نے یہ بھی لکھا ہے کہ امیر خسرو اپنے اشعار کے اچھے ہونے کا معیار ان کی پسندیدگی پر رکھتے تھے (۵۹)۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خسرو اپنے اشعار ان کے سامنے اصلاح یا رائے دہی کے لیے پیش کرتے تھے اور اسے قابل فخر سمجھتے تھے۔

حال کے مصنفین میں سعید احمد مارہروی نے اپنی تصنیف "حیات خسرو" میں اور قاضی اختر جونا گڑھی نے اپنے مضمون "امیر خسرو اور تصوف" (۶۰) میں خواجہ شمس الدین خوارزمی کو بھی امیر خسرو کا استاد قرار دیا ہے۔ اختر جونا گڑھی نے ان کا نام محض مولانا شمس الدین تحریر کیا ہے، لیکن جو واقعات اور حالات پیش کیے ہیں وہ وہی ہیں جو خواجہ شمس الدین خوارزمی استاد حضرت نظام الدین اولیا سے منسوب ہیں (۶۱)، اس لیے یہ شمس دبیر نہیں ہو سکتے۔ سعید احمد مارہروی نے تحریر کیا ہے کہ خواجہ شمس الدین خوارزمی نے خسرو کی مشہور تصنیف "پنج گنج" کی اصلاح فرمائی ہے اور دیباچہ "دیوان غرۃ الکمال" اور "پنج گنج" کے آخری گنج یعنی "ہشت بہشت" میں خسرو نے آپ کے علم و فضل کی بہت تعریف کی ہے اور ان کی شاگردی کا اعتراف کیا ہے۔ اس

ذیل میں فاضل مصنف نے وہ قصیدہ بھی نقل کیا ہے جو فی الحقیقت شمس دبیر کا ہے (۶۲)۔ ان مصنفوں نے شمس دبیر اور مولانا شمس الدین خوارزمی بلکہ شہاب الدین مہمرہ کو بھی خلط ملط کر دیا ہے۔ کیوں کہ "ہشت بہشت" کی اصلاح شہاب مہمرہ نے کی تھی اور اس مثنوی کے آخر میں خسرو نے انھیں کی تعریف بھی کی ہے اور امیر خسرو کو ان کا تلمذ حاصل ہوا ہے۔ یہاں صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ خسرو نے اپنے بعض اشعار شمس دبیر کے سامنے اصلاح یا رائے کے لیے پیش کیے تھے۔

ان مذکورہ اساتذہ کے علاوہ خسرو کے پیر طریقت حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کا ذکر ضروری ہے، جنھوں نے راہِ سلوک میں خسرو کی رہنمائی کی اور انہیں مستفیض کیا اور جن کا فیض خسرو کی شاعری میں بھی جاری و ساری رہا۔

خسرو کا تمام خاندان خواجہ نظام الدین اولیا کے حلقۂ ارادت میں داخل تھا۔ ان کے نانا عماد الملک اور ان کے والد سیف الدین محمود دونوں ان کے مرید تھے (۶۳)، اس لیے ان کو بچپن ہی سے حضرت خواجہ کے فیوض و برکات سے استفادے کا موقع ملا۔ حضرت نظام الدین اولیا چشتی سلسلے کے ایک معروف اور ممتاز صوفی بزرگ تھے۔ ان کی قیام گاہ خسرو کے نانا عماد الملک کے مکان سے قریب ہی تھی (۶۴)۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ آٹھ سال کی عمر میں ہی خسرو حضرت خواجہ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے تھے، لیکن خسرو کے اپنے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ۶۷۱ھ / ۱۲۷۲ء میں

باقاعدہ مرید ہوئے (۶۵)۔ خسرو اپنی شاعری کے سارے کمالات کو محض اپنے
مرشد کی برکت سمجھتے تھے۔ مثنوی " نہ پسپھر " میں اپنے مرشد کی شان میں ایک
قصیدے میں کہتے ہیں:

خوش اندم کہ من زاعتقاد ضمیر
گرفتم بحق دست آں دست گیر

بہ نہ بحر از آں جانبم راہ شد
چو کشتیء مرادست آں شاہ شد

من از وے لعابِ دہاں یافتم
کہ زیں گو نہ آب دہاں یافتم (۶۶)

خسرو جو بھی نظم کہتے حضرت خواجہ کی خدمت میں پیش کرتے۔ ایک
مرتبہ حضرت خواجہ نے ان سے کہا کہ اصفہان کے شعراء کے طرز میں کہا کرو،
یعنی کلام عشق انگیز ہو (۶۷)۔ خسرو نے اسی پر عمل کرنا شروع کیا اور اس کو
انتہا تک پہنچا دیا۔ ایک بار انھوں نے حضرت خواجہ کی مدح کہی اور جب اسے
سنایا تو حضرت خواجہ نے پوچھا کہ کیا صلہ چاہتے ہو۔ خسرو نے کہا " کلام میں
شیرینی "۔ اس وقت چارپائی کے نیچے طشت میں شکر رکھی تھی۔ حضرت خواجہ
نے شکر کو سر پر چھڑکنے اور کچھ کھانے کی ہدایت کی۔ خسرو نے ایسا ہی کیا۔ چنا ں
چہ اس کے بعد ان کے کلام میں بڑی شیرینی پیدا ہو گئی۔ خسرو آخر میں پچھتاتے
تھے کہ کوئی اور بہتر صلہ مانگتے تو وہی ملتا (۶۸)۔ تذکرہ نویسوں کا خیال ہے کہ
خسرو کے کلام میں روز بروز لطافت، حلاوت اور شوکت ان کے مرشد کی دعاؤں

اور کرامات کی بدولت پیدا ہوتی گئی (۶۹)۔ حضرت خواجہ کی صحبت میں رہتے رہتے امیر خسرو نے جس عشق مجازی کو اپنے کلام میں پیش کرنا شروع کیا تھا وہ عشق الہیٰ سے بدل گیا۔ رفتہ رفتہ ان میں عشق الہیٰ کی ایسی سوزش پیدا ہو گئی کہ حضرت خواجہ فرماتے تھے کہ قیامت کے روز اگر مجھ سے پوچھا جائے گا کہ کیا لائے تو میں کہوں گا کہ "ترک اللہ کا سوز سینہ" (۷۰)۔ حضرت خواجہ کی جو جو نوازشیں خسرو کے حال پر ہوتی تھیں، خسرو ان کو نقل کرتے رہتے تھے۔ انھیں ملفوظات اور فرمودات کا مجموعہ "افضل الفوائد" ہے، جن کے ذریعے خسرو اور حضرت خواجہ کے مابین تعلقات کی نوعیت کا علم بھی ہوتا ہے۔ حضرت خواجہ ہی کے اثرات تھے کہ خسرو کے اشعار بقول شبلی "بجلیاں گراتے ہیں" اور وہ "اسی وادی ایمن کی شرر باریاں ہیں" (۷۱)۔

حواشی :

(۱) دولت شاہ سمرقندی "تذکرہ الشعراء" قلمی، مملوکہ معین الدین عقیل، ص ۲۵۹، وحید مرزا "Life and Works of Amir Khusrau" (لاہور، ۱۹۶۲ء)، ص ۸، ۹ و بعدہ۔

(۲) خسرو "دیباچہ غرۃ الکمال" (مطبع قیصریہ، دہلی، بار اول) ص ۳۷

(۳) ضیاء الدین برنی "تاریخ فیروز شاہی"، اردو ترجمہ (لاہور ۱۹۶۹ء) ص ۳۰۵ (۴) خسرو "دیباچہ دیوان غرۃ الکمال"، ص ۔ ۶۸، ۶۹

(۵) ایضاً ص ۶۹

(۶) ایضاً

(۷) ایضاً

(۸) ایضاً

(۹) ایضاً

(۱۰) تفصیلات کے لیے ضیاء الدین برنی، ص ۱۹۷ ۔ ۲۰۰

(۱۱) ایضاً، ص ۱۹۷ و نیز خسرو "دیباچہ غرۃ الکمال"، ص ۶۹

(۱۲) صباح الدین عبدالرحمن "بزم مملوکیہ" (اعظم گڑھ ۔ ۱۹۵۴ء)، ص ۲۹۳

(۱۳) وحید مرزا "امیر خسرو" (الہ آباد ۱۹۴۹ء)، ص ۴۲ ۔ خسرو کی عملی اور فنی استعداد کے لیے ایضاً، ص ۴۳ ۔ ۵۰

(۱۴) ہندی دانی کے لیے، خود ان کا بیان "دیباچہ دیوان غرۃ الکمال" ص ۶۶ میں ہے ۔

(۱۵) خسرو "دیباچہ دیوان غرۃ الکمال"، ص ۶۹

(۱۶) وحید مرزا، انگریزی اشاعت، ص ۱۹

(۱۷) خسرو "دیباچہ تحفۃ الصغر"، بحوالہ ایضاً، ص ۲۰

(۱۸) وحید مرزا، انگریزی، ص ۲۱

(۱۹) بحوالہ صباح الدین عبدالرحمن "بزم مملوکیہ"، ص ۲۹۰

(۲۰) بحوالہ وحید مرزا، اردو اشاعت، ص ۲۸

(۲۱) ص ۲۹

(۲۲) یہ روایت "دیباچہ تحفتہ الصغر" سے متعدد مصنفین نے ملخص کی ہے۔ جیسے وحید مرزا، اردو، ص ۲۸-۲۹۔ انگریزی، ص ۲۱-۲۲۔ شبلی نعمانی "شعرالعجم" جلد دوم (لاہور ۱۹۴۶ء)، ص ۸۴-۸۵، صباح الدین عبدالرحمن "بزم مملوکیہ"، ص ۲۹۰-۲۹۱ وغیرہ۔

(۲۳) شبلی، ص ۸۵

(۲۴) اس کی مثالوں کے لیے ایضاً، ص ۱۱۱-۱۱۲؛ وحید مرزا اردو، ص ۲۵

(۲۵) صباح الدین عبدالرحمن "ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں" (اعظم گڑھ، ۱۹۶۶ء) ص ۲

(۲۶) شبلی، ص ۱۱۰

(۲۷) ملا عبدالقادر بدایونی نے "منتخب التواریخ" میں مولانا شہاب الدین کے ساتھ مہمرہ ہی تحریر کیا ہے۔ (اردو ترجمہ، لاہور، ۱۹۶۲ء)، ص ۶۔ جب کہ "مجمع الفصحا" (مؤلفہ رضا قلی خاں) میں مہتمرہ ہے۔ (صباح الدین عبدالرحمن، شہاب الدین مہمرہ استاد امیر خسرو" ۔ مقالہ: مشمولہ "معارف" (اعظم گڑھ۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء، ص ۲۴۵) اسی طرح "منتخب التواریخ" کے انگریزی مترجم جارج رین کنگ نے "مجمع الفصحا" کی سند پر مہتمرہ ہی کو درست خیال کیا ہے (جلد اول، ص ۹۹ بحوالہ ایضاً) ۔ دیگر تذکروں مثلاً "مجمع النفائس"، "عرفات العاشقین"، "گل رعنا" اور "مخزن الغرائب" کے مؤلفوں نے مہمرہ ہی لکھا ہے۔ مولانا عبدالحی نے "نزہتہ الخواطر" میں مولانا شہاب الدین کے والد کا نام "جمال الدین المہروی البدایونی" لکھا ہے۔ اردو ترجمہ، جلد اول (لاہور، ۱۹۶۵ء)، ص ۲۳۶۔

(۲۸) عبدالقادر بدایونی، ص ۶۹

(۲۹) مثنوی "ہشت بہشت" (مطبوعہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس، ۱۹۱۸ء)، ص ۲۲۶

(۳۰) ص ۶۴

(۳۱) ایضاً

(۳۲) نظامی بدایونی "قاموس المشاہیر" جلد دوم (بدایوں، ۱۹۲۶ء)، ص ۲۸

(۳۳) "تاریخ فرشتہ" اردو ترجمہ، جلد اول (لکھنؤ ۱۹۳۱ء)، ص ۱۸۷

(۳۴) ص ۶۹

(۳۵) ایضاً، ص ۷۰

(۳۶) مولانا عبدالحی "نزہتہ الخواطر" جلد دوم (لاہور ۱۹۶۵ء)، ص ۹۲

(۳۷) ان کے شعری اور فنی محاسن کے لیے صباح الدین عبدالرحمن " مولانا شہاب الدین مہمرو استاد امیر خسرو " ص ۲۵۷-۲۶۴؛ بزم مملوکیہ ۱۵۹-۱۶۷

(۳۸) ص ۱۱۰-۱۱۱

(۳۹) اردو، ص ۳۲

(۴۰) ایضاً، ص ۳۳-۳۴

(۴۱) انگریزی، ص ۱۱۱

(۴۲) ایضاً

(۴۳) ایضاً، ص ۳۰۳

(۴۴) ایضاً، ص ۳۱۸

(۴۵) فرشتہ، جلد دوم، ص ۲۸۹

(۴۶) "فوائد الفواد"، اردو ترجمہ (لاہور ۱۹۷۳ء)، ص ۸

(۴۷) ایضاً، ص ۲۶۸-۲۲۰

(۴۸) عبدالحی "نزہتہ الخواطر" جلد دوم، ص ۸۲

(۴۹) ایضاً

(۵۰) حسن سجزی " فوائد الفواد " ص ۲۶۸، جلال الدین جمالی " سیر العارفین " اردو ترجمہ، پروفیسر محمد ایوب قادری (لاہور ۱۹۷۵ء)، ص ۷۰ میں ہے کہ مولانا شمس دبیر، غیاث الدین کے لڑکے ناصر الدین محمود بغراخاں کے دبیر ہوئے۔ ونیز عبدالقادر بدایونی، ص ۷۷۔

(۵۱) ایضاً

(۵۲) جیسا کہ خود خسرو نے " دیباچہ دیوان غرۃ الکمال " میں اشارہ کیا ہے، ص ۲۷۔

(۵۳) صباح الدین عبدالرحمن " بزم مملوکیہ "، ص ۲۷۵۔

(۵۴) قاضی اثیر اس زمانے کے ایک بزرگ اور بلند پایہ شاعر اور شمس دبیر اور خسرو کے مقرب تھے۔

(۵۵) "دیباچہ دیوان غرۃ الکمال" ص ۷، یہاں دہلی میں کشلو خاں (ملک چھجو) کی مجلس شعرو شاعری کا ذکر ہے، جس میں شہزادہ بغرا خاں کے ساتھ مولانا شمس دبیر اور قاضی اثیر بھی شریک ہوئے تھے۔

(۵۶) جیسے ص ۷۱-۷۲ وغیرہ۔

(۵۷) عبدالحی، جلد دوم، ص ۸۲

(۵۸) ص ۷۷

(۵۹) ایضاً

(۶۰) مشمولہ "مقالات اختر" (کراچی) ۱۹۷۲ء، ص ۳۹

(۶۱) خواجہ شمس الدین خوارزمی کے بارے میں تفصیلات کے لیے شیخ عبدالحق محدث دہلوی "انوار صوفیہ" اردو ترجمہ "اخبار الاخیار" (لاہور ۱۹۶۷ء)، ص ۱۶۴-۱۶۵، فرشتہ "تاریخ فرشتہ" جلد دوم، ص ۶۳۶-۶۳۷، عبدالحی "نزہتہ الخواطر" جلد اول، ص ۲۴۳، صباح الدین عبدالرحمن "بزم مملوکیہ" ص ۲۳۳-۲۳۵، "بزم صوفیہ" (اعظم گڑھ ۱۹۴۹ء) ص ۱۸۱ وغیرہ۔

(۶۲) صباح الدین عبدالرحمن "بزم مملوکیہ"، ص ۲۷۹۔

(۶۳) ایضاً، ص ۲۹۸

(۶۴) حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کچھ عرصہ عماد الملک کے مکان میں بھی مقیم رہے۔ محمد حبیب "Amir Khusrau of Delhi" (کلکتہ، ۱۹۳۵ء)، ص ۲۷۔

(۶۵) وحید مرزا، اردو، ص ۱۶۱

(۶۶) "نہ سپہر" (کلکتہ ۱۹۴۹ء) ص ۲۷۔ یہ پورا قصیدہ ص ۲۳ تا ۲۸ پر محیط ہے۔ و نیز ایسے ہی جذبات "دول رانی خضر خاں" (علی گڑھ ۱۹۱۸ء) ص ۱۹-۲۱ میں ہیں۔

(۶۷) صباح الدین عبدالرحمٰن "بزم مملوکیہ" ص ۲۹۸

(۶۸) ایضاً، ص ۲۹۸-۲۹۹

(۶۹) ایضاً، ص ۲۹۸

(۷۰) داراشکوہ "سفینتہ الاولیا" اردو ترجمہ، غلام دستگیر نامی (لاہور، بار اول) ص ۳۸۴، حضرت خواجہ پیار سے خسرو کو "ترک" کہتے تھے۔ پھر "ترک اللہ" کہنے لگے تھے۔

(۷۱) ص ۹۹

خسرو کا حادثۂ اسیری

امیر خسرو کے ساتھ یہ حادثہ اس وقت پیش آیا تھا۔ جب وہ شہزادہ سلطان محمد کی سرپرستی میں تھے اور اس کے ساتھ مغلوں کے انسداد کی ایک مہم میں شریک تھے۔ اس مہم میں شہزادہ سلطان محمد تو شہید ہو گیا لیکن خسرو دیگر شرکائے لشکر کے ساتھ مغلوں کے قیدی بنا لیے گئے۔

خسرو شہزاد سلطان محمد کے ساتھ ۶۷۸ھ / ۱۲۷۹ء میں وابستہ ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ وابستگی سے قبل وہ بغرا خاں کے ساتھ سامانہ میں اس کے ندیم خاص کی حیثیت سے رہتے تھے (۱)۔ اسی سال بغرا خاں اپنے باپ بلبن کے ساتھ طغرل کی بغاوت کو دبانے کے لیے لکھنوتی گیا تو خسرو بھی اس کے لشکر میں موجود تھے (۲)۔ جب وہ لکھنوتی پہنچے تو یہ جگہ ان کو پسند نہ آئی۔ بغرا خاں نے بعد میں ان کو روکنا چاہا لیکن انھوں نے وہاں رکنا پسند نہ کیا اور بلبن کے ساتھ دہلی واپس چلے آئے۔ لکھنوتی کی مہم میں بلبن کو جو فتح و کامرانی حاصل ہوئی، اس کا جشن دہلی میں دھوم دھام سے منایا گیا۔ اس موقع پر باپ کی خدمت میں مبارک باد پیش کرنے کے لیے شہزادہ سلطان محمد بھی، جو اس وقت ملتان کے اقطاع پر متمکن تھا، قیمتی تحائف لے کر ملتان سے دہلی آیا (۳)۔

شہزادہ سلطان محمد، سلطان غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶ء - ۱۲۸۷ء) کا بڑا بیٹا تھا۔ بلبن کو اپنے بیٹوں کی دینی اور دنیاوی تعلیم کا بڑا خیال رہا (۴)۔ اس کی توجہ سے اس کے بڑے بیٹے سلطان محمد میں گوناگوں اوصاف پیدا ہو گئے۔ وہ نہ صرف اپنی شجاعت، نبرد آزمائی، تدبر اور بصیرت کے لیے سب کی نظروں میں مقبول تھا، بلکہ اپنے عادات و اطوار کے لحاظ سے بھی خاص و عام اور مشائخ و علماء سب کی نظروں میں محبوب تھا (۵)۔ سلطان بلبن بھی اس کو اس کے پسندیدہ خصائل کی وجہ سے بہت ہی عزیز رکھتا تھا (۶)۔ شہزادے کی مجلس فضلا و شعرا سے بھری رہتی تھی۔ ارباب ذوق اس کی شعر فہمی کے بے حد معترف تھے۔ خود خسرو کے خیال میں سخن فہمی، باریک بینی، ذوق صحیح اور متقدمین اور متاخرین کے اشعار کو حافظے میں رکھنے میں شہزادے سلطان محمد جیسا انھوں نے کسی اور کو نہ پایا (۷)۔ شہزادے کا علمی دربار ملتان میں لگتا تھا اور دہلی میں بلبن کے دربار میں علماء و فضلاء کا بڑا اجتماع ہوتا تھا۔ لیکن ان میں سے بعض اہل علم شہزادہ سلطان محمد کی فیاضی اور علم دوستی کا سن کر دہلی سے ملتان منتقل ہو گئے (۸)۔

یہ علم پرور اور عالم شناس شہزادہ خسرو کا کلام پہلے ہی سن چکا تھا۔ دہلی کے قیام کے دوران خسرو کا تازہ کلام سن کر وہ بے حد محظوظ ہوا۔ چناں چہ خسرو کو خلعت و انعام اور اکرام سے نوازا۔ اور پھر اپنا ندیم خاص بنا لیا۔ اور جب ملتان واپس جانے لگا تو ان کو ساتھ بھی لیتا گیا۔ امیر حسن سجزی بھی، جو خسرو کے قریبی دوست بھی تھے، شہزادے کے ساتھ گئے۔ خسرو شہزادے کے

مصحف دار اور حسن سجزی دواتِ دار مقرر ہوئے (۹)۔ پانچ سال تک ان دونوں جلیل القدر شاعروں نے شہزادے کی بزم کو اپنی شاعری سے بہت با رونق بنائے رکھا (۱۰)۔ لیکن خسرو کو دہلی کی یاد برابر ستاتی رہی اور وہ اسے یاد کر کے بے چین ہو جاتے تھے۔ شہزادہ محمد کا معمول تھا کہ وہ اپنے باپ سے ملنے کے لیے ہر سال دہلی جاتا تھا (۱۱)، چناں چہ خسرو بھی اس کے ساتھ ہر سال دہلی آتے۔ لیکن جب اپنی والدہ اور بیوی سے رخصت ہوتے تو ان کو انتہائی ملال رہتا، جب کہ حال ہی میں ان کی شادی ہوئی تھی (۱۲)۔ اس کے باوجود شہزادہ محمد کی عنایتوں کے طفیل خسرو کی زندگی کا یہ دور مسرتوں سے معمور رہا (۱۳)۔ لیکن خسرو کو شہزادہ محمد کی سرپرستی سے جلد ہی محروم ہونا پڑا۔

۶۸۳ھ / ۱۲۸۴ء میں چنگیز خانی مغلوں نے التمیر خاں کی قیادت میں ہندوستان پر حملہ کیا اور دیپال اور لاہور کو تاراج کرتے ہوئے ملتان کی جانب بڑھے۔ شہزادہ محمد نے ملتان سے نکل کر لاہور کے قریب دریا کے کنارے ایتمر خاں کا مقابلہ کیا (۱۴) اور اس کو نہ صرف شکست دی بلکہ اس کے تعاقب میں آگے بھی بڑھا۔ ایک مقام پر شہزادہ محمد ظہر کی نماز کے لیے دریا کے کنارے پانچ سو لشکریوں کے ساتھ ٹھہرا کہ یکایک دو ہزار مغل کمیں گاہوں سے نکل کر لشکر پر حملہ آور ہوئے، جس کے نتیجے میں شہزادہ محمد شہید ہو گیا (۱۵)۔ اس لشکر میں خسرو اور حسن سجزی بھی اس کے ہم رکاب تھے۔ شہزادے کی شہادت کے بعد مغل ان دونوں کو قید کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ یہ حادثہ بروز جمعہ ذی الحجہ ۶۸۳ھ / ۱۲۸۴ء کے آخری اور ۶۸۴ھ / ۱۲۸۵ء کے پہلے دن

پیش آیا تھا(۱۶)۔

خسرو نے اس واقعے کا ذکر اپنے "دیوان غرۃ الکمال" کے دیباچے میں (۱۷) اپنی اس گرفتاری کا حال اپنے قصیدے "حکم الحکم" میں بہت ہی پردرد انداز میں تحریر کیا ہے۔ اس میں تقریباً دو سو اشعار ہیں۔ اس کی ابتدا فقر و تصوف اور واعظ و حکم سے کی گئی ہے۔ پھر بتایا گیا ہے کہ شہزادہ محمد کی شہادت کے بعد اس کے سپاہی خاک اور خون میں آلودہ ہو گئے۔ مغلوں نے ان کے سر قطع کر دیے۔ خسرو گرفتار کر لیے گئے اور ایک بدشکل، چوڑے منہ کندہ دہن اور کچی داڑھی والے مغل کے حوالے کر دیے گئے، جو خود تو گھوڑے پر سوار ہوا لیکن خسرو کو پیاسا اور برہنہ پا پیادہ گھسیٹتا ہوا اپنے ساتھ لے چلا۔ ان کے پاؤں میں آبلے پڑ گئے اور وہ تھکان سے لاغر ہو گئے۔ ان کی آنکھوں سے تکلیف کے سبب اشک مسلسل رواں تھے۔ اس پر ستم یہ کہ سفر کے دوران ان کے مغل ساتھی نے ان کے سر پر توبرہ بھی چڑھا دیا:

اسیر گشتم واز بیم آں کہ خون ریزد
نمی نماند ز خون در تن نحیف و نزار

چو آب بے سرد پا نی دویدم و چو حباب
ہزار آبلہ در پا ز رفتن بسیار

نہ پایہائے من از آبلہ جُدا شد پوست
چناں کہ باز شود در نہ پائے ہا افزار

زرنج سخت شدو جان چو قبضۂ شمشیر

زرنج سخت شدو جان چو قبضۂ شمشیر
ضعف چوب شدہ تن چودستہ جفار
دے نماند بنایم زلودہ رہ تشنہ
دے شدہ شکم من زماندۂ ناچار
برہنہ ماندہ تن چوں درخت گاہ خزاں
ہزار بارد چوگل از خواش خارت آزار
بگریہ مردمک دیدہ قطرہای ریخت
چناں کہ گردن عروسی ہا بگسا آزار
فروجۂ کہ مرا پیش کردہ رومی رفت
نشستہ برفر شے چوں پلنگ در کہسار
کشادہ از دہنش نکہتے چو بوئے بغل
فتادہ برزنحش سبلتے چو موئے زہار
زماندگی قدمے گر بیماند می بستوہ
گہے طفانہ کشیدے ختم جوں تکمار

ooooo

من کہ بر سرنمی ہنادہ گل
تو برہ برسر ہنادہ و گفتا جل

شبلی نعمانی (۱۸) اوراحمد سعید مارہروی (۱۹) کے خیال میں مغل خسرو کو گرفتار کر کے بلخ لے گئے تھے۔ لیکن انھوں نے اس کی کوئی سند فراہم ہنیں کی

ہے۔ پھر شبلی نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ خسرو مغلوں کی قید میں دو سال تک رہے (۲۰)۔ یہ بات بھی درست نہیں معلوم ہوتی، کیوں کہ خسرو نے خود اپنی مثنوی "دول رانی خضر خاں" میں بعض اشعار اپنی اسیری کے بارے میں تحریر کیے ہیں۔ ان میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ اس وقت جب وہ مغلوں کے ہاتھوں اسیر ہو گئے تھے تو انھیں ریگستان میں چلنا پڑا۔ گرمی بڑی شدید تھی جس کی شدت سے ان کا سر دیگ کی طرح پک رہا تھا۔ سفر کے دوران وہ اور ان کا ساتھی مغل، جو انہیں قید کر کے لیے جا رہا تھا، دونوں شدید پیاسے تھے کہ راستے میں ایک چشمے پر پہنچے۔ پیاس بجھانے میں خسرو نے بڑی احتیاط کی اور صرف اپنے خشک ہونٹ تر کر لیے۔ ان کے دل و جگر میں کچھ ٹھنڈک تو پیدا ہو گئی مگر ان کا مغل ساتھی اور اس کے گھوڑے نے شدتِ پیاس سے مجبور ہو کر ضرورت سے زیادہ ہی پانی پی لیا اور اتنا پیا کہ گر کر ہلاک ہو گئے:

در آیامی کہ ایں نفس بد آموز
گرفتار مغل شدہ در ز امروز

بیاباں می بریدم ریگ بر ریگ
زبس گرما سرم جوشیدم چوں دیگ

من و ما من چو من تشنہ سواری
رسیدیم از رہ اندر جوئباری

من ازچہ لقطہ جانم بود در تاب
ندارم لفظ خود را روغن از آب

لبے تر کردم و ترشد جگر ہم
سکونت یافتہ لختے جان درہم
فتاداں تشنہ وزاں نشد تر رخش
کہ بخش جاں بروزاں آب جاں بخش
ہم او سیراب شدہم مرکبش سیر
نشد در دادن جاں مرد را دیر (۲۱)

اس واقعے سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ خسرو ملتان سے کچھ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ اتفاق کے سہارے ان کو رہائی حاصل ہو گئی اور غالباً اسی روز ملتان واپس آ گئے (۲۲)۔

اسیری سے رہائی کے کچھ دنوں بعد خسرو دہلی واپس آئے۔ لیکن اس رہائی سے وہ خوش نہ تھے، مقتول اور بچھڑے ہوئے دوستوں کی یاد میں بے چین رہے۔ اسی گرفتاری اور اسیری میں اپنے مربی کی شہادت پر دو نہایت ہی درد انگیز اور المناک مرثیے لکھے۔ پہلا مرثیہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے:

واقعہ است ایں یا بلا کز آسماں آمد پدید
آفت است ایں یا قیامت کز جہاں آمد پدید

اس مرثیے میں جنگ کا پس منظر اور شہزادے کی شہادت کے واقعات بھی تفصیل سے بیان ہوئے ہیں اور دوسرے مرثیے کا مطلع یہ ہے:

اے دل بہ غم نشیں کہ زشادی نشاں نماند
اے دیدہ خوں گری کہ طرب دو جہاں نماند

یہ دونوں مرثیے ترکیب بند میں ہیں اور "دیوان وسط الحیات" میں شامل ہیں۔ ان مرثیوں کے علاوہ خسرو نے کئی رباعیوں میں بھی اپنے اس رنج والم کا اظہار کیا (۲۳)۔ ایک مدت تک لوگ گھر گھر ان مرثیوں کے اشعار پڑھتے تھے اور اپنے مقتول عزیزوں کا ماتم کرتے تھے (۲۴)۔

حواشی:

(۱) امیر خسرو "دیباچہ دیوان غرۃ الکمال" (دہلی تاریخ ندارد)، ص ۱۔
(۲) ایضاً، ص ۲۔
(۳) تفصیلات کے لیے ضیاء الدین برنی "تاریخ فیروز شاہی" (لاہور۔ ۱۹۶۹ء)، ص ۱۸۹۔
(۴) تفصیلات کے لیے ایضاً، ص ۳۳۷۔ ۳۳۸
(۵) صباح الدین عبدالرحمن "بزم مملوکیہ" (اعظم گڑھ ۱۹۴۱ء)، ص ۲۴۷۔
(۶) برنی تصنیف مذکور، ص ۱۸۹۔ ۱۹۱۔
(۷) خسرو "دیباچہ دیوان غرۃ الکمال"، ص ۵۔
(۸) ڈاکٹر وحید مرزا "امیر خسرو" (ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد۔ ۱۹۴۹ء)، ص ۶۶۔ ۶۷۔
(۹) فرشتہ "تاریخ فرشتہ" اردو ترجمہ، جلد دوم (لکھنو ۱۹۳۲ء)، ص ۶۵۷۔
(۱۰) عبدالقادر بدایونی "منتخب التواریخ" اردو ترجمہ (لاہور۔ ۱۹۶۱ء)، ص ۱۸۰۔ خسرو خود ہی "غرۃ الکمال" کے دیباچے میں لکھتے ہیں: "پنج سال دیگر پنج آب ملتان را از بحور نطائف فانی آب دادم"۔ ص ۲۔
(۱۱) بدایونی، تصنیف مذکور، ص ۸۰
(۱۲) وحید مرزا "امیر خسرو"، ص ۲
(۱۳) ایضاً "LIFE AND WORKS OF AMIR KHUSRAU" (لاہور ۱۹۶۲ء)، ص ۲۳۔
(۱۴) بدایونی، تصنیف مذکور، ص ۸۱
(۱۵) فرشتہ، تصنیف مذکور، جلد اول، ص ۱۲۴
(۱۶) برنی، تصنیف مذکور، ص ۱۸۹
(۱۷) خسرو "دیباچہ غرۃ الکمال" ص ۲
(۱۸) "شعر العجم" (لاہور، ۱۹۴۴ء) جلد دوم، ص ۸۸
(۱۹) "حیاتِ خسرو"، ص ۲۱ و بعدہ۔
(۲۰) "شعر العجم" جلد دوم، ص ۸۹

(۲۱) "دول رانی خضر خاں" (علی گڑھ ۱۹۱۸ء)، ص ۳۶

(۲۲) وحید مرزا "LIFE AND WORKS OR AMIR KHUSRAU" ص ۶۲ و نیز محمد حبیب "AMIR KHUSRAU OF DELHI" ۱۹۲۵ء) ص ۱۷۔

(۲۳) اس کا ایک انتخاب وحید مرزا "امیر خسرو" ص ۸۴۔۸۵ میں ہے۔

(۲۴) بدایونی، تصنیف مذکور، ص ۸۱

تاریخ

اعجاز خسروی کا تاریخی پہلو

"اعجاز خسروی" یا "رسائل الاعجاز" مرصع نثرنگاری پر مبنی امیر خسرو کے پانچ رسائل کا مجموعہ ہے، جن میں سے پہلے چار ۱۲۸۳ء / ۶۸۲ھ میں اور آخری ۱۳۱۹ء / ۷۱۹ھ میں تصنیف ہوئے تھے (۱)۔ ہر رسالے میں کئی "خط" یا ابواب ہیں اور ہر ایک "خط" میں متعدد "حرف" یا مضامین ہیں ۔ اس تصنیف میں خسرو کے زمانے کے بہترین اسالیبِ نثر کے نمونے ملتے ہیں (۲)۔ چوں کہ خسرو نے بلبن (۱۲۶۶ء - ۱۲۸۷ء) سے لے کر محمد بن تغلق (۱۳۲۵ء - ۱۳۵۱ء) تک کئی سلاطین کا دور دیکھا تھا، اس لیے ان کی تاریخی تصانیف اور ان کی مثنویات سلطنتِ دہلی کے ایک بڑے دور کا احاطہ کرتی ہیں ۔ ان میں قرون وسطیٰ کی تاریخ کے طالبِ علموں کے لیے اچھا خاصہ مواد موجود ہے ۔ متعدد مؤرخین اور محققین نے خسرو کی ان تصانیف سے خوب استفادہ کیا ہے ۔ لیکن " اعجاز خسروی "، جو فی الحقیقت مذکورہ اہمیت کی حامل بھی ہے، اس پہلو کے جائزے سے محروم رہی ہے ۔ بیشتر مصنفین نے اس تصنیف کے محض ادبی محاسن کے جائزے پر اکتفا کی ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہہ دیا ہے کہ اس میں مخصوص دستاویزات اور خطوط شامل ہیں، جنھیں خود خسرو نے لکھا تھا (۳)۔ دراصل اس میں ادبی، نحوی، لغوی کے ساتھ ساتھ تاریخی اور معاشرتی معلومات بھی

موجود ہیں اور اس کے ذریعے خسرو کے عہد کے کوائف اور حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے ۔ خصوصاً دوسرے، چوتھے اور پانچویں رسالوں میں بعض سیاسی اور تاریخی نوعیت کے خطوط اور شاہی فرامین شامل ہیں ۔ ان کی وجہ سے یہ تصنیف سیاسی اور معاشرتی دل چسپی کے بہت سے موضوعات کی حامل ہے ۔ چوں کہ یہ تصنیف مرصع اور مزین نثری نمونوں پر مشتمل ہے اور اس مقصد کی حامل ہے کہ مختلف قسم کے صنائع اور بدائع کے استعمال کو وضع کیا جائے (۴)، اس لیے یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ اس میں جو طویل طویل فرامین اور حکم نامے مسجع و مرصع نثر میں اور ایک خاص اسلوب میں تحریر ہیں کہ جس کے بارے میں خسرو کا دعویٰ ہے کہ وہ ان کی اپنی ایجاد ہے (۵)، آیا وہ حقیقت پر مبنی بھی ہو سکتے ہیں؟ لیکن اس حقیقت کے پیش نظر کہ ان کا مصنف اپنے عہد کے سیاسی واقعات اور معاشرتی حالات پر گہری نظر رکھتا ہے اور خود ان میں شریک بھی رہا ہے، اس تصنیف کے بیشتر موضوعات اور مندرجات، واقعات اور ان کے سنین، شخصیات اور ان کے نام اور مقامات جو تاریخ کے عام قاری کی نظروں سے پوشیدہ ہیں، اس تصنیف کی تاریخی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔ اس کی یہی اہمیت کیا کم ہے کہ ہمیں اس کے ذریعے اس وقت کے برعظیم پاک و ہند کی معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی صورتِ حال کا علم ہوتا ہے ۔(۶)

تاریخی ترتیب کے اعتبار سے پہلی اہم دستاویز جو ہمیں ملتی ہے وہ "فتح نامہ لکھنوتی" ہے (۷)۔ اسے خسرو نے اپنی نوجوانی میں مرتب کیا تھا، جب وہ

ابھی کہنہ مشق نہیں تھے۔ یہ ان کی پہلی کوشش تھی۔ جیسا کہ خود کہتے ہیں:

" ایں فتح نامہ در عہد سلطان مرحوم غیاث الدین در فتح لکھنوتی بود،
اول امتحانی بود کہ قلم انشا خود را کردم (۸)۔

اس فتح نامہ کو غیاث الدین بلبن نے لکھنوتی کی فتح کے بعد دہلی بھیجا تھا اس کی لکھنوتی کی یہ مہم طغرل کے خلاف تھی۔ طغرل ایک ترک غلام تھا جسے بلبن نے خریدا تھا اور بلبن ہی نے اس کو بنگال اور لکھنوتی کا والی مقرر کیا تھا (۹)۔ طغرل جہاں چستی و چالاکی اور بہادری و سخاوت کے لیے مشہور تھا، وہیں وہ جذباتی، خود غرض اور بے باک بھی تھا اور اس کے دماغ میں حکمرانی کا خبط سمایا ہوا تھا (۱۰)۔ چنانچہ وہ اپنی فتوحات سے مغرور ہو کر خود مختار ہو گیا اور سلطان معزالدین کا خطاب اختیار کیا اور اس کو فخر کے ساتھ خطبہ اور سکے میں شامل کر لیا (۱۱)۔ بلبن کو طغرل کی یہ بغاوت اور سرکشی بہت ناگوار ہوئی۔ اس نے امین خاں کو بغاوت فرو کرنے پر مامور کیا، لیکن امین خاں کو شکست ہوئی (۱۲)۔ ایک دوسرا لشکر بھی، جو ملک طرغی کی سرکردگی میں تھا، ناکام ہوا۔ اس کے نتیجے میں بلبن خود لکھنوتی کی طرف روانہ ہوا۔ ساتھ ہی اس نے اطراف کے لشکروں کو بھی طلب کیا اور اپنے دوسرے بیٹے بغرا خاں کو اپنے ساتھ شامل کر لیا (۱۳)۔ شاہی لشکر کے پہنچنے پر طغرل اپنی فوج کے ساتھ جاج نگر فرار ہو گیا اور بالآخر وہیں قتل ہوا (۱۴)۔ اس مہم میں امیر خسرو، بغرا خاں کے لشکر میں شریک تھے (۱۵)۔ ضیاء الدین برنی کے مطابق یہ فتح نامہ ملک قوام الدین دبیر نے لکھا تھا (۱۶)۔ خلیق احمد نظامی کے خیال میں ایسے مواقع پر ایک سے زیادہ فتح نامے تحریر کیے جاتے تھے یا پھر یہ کہ امیر خسرو کا تحریر کردہ فتح نامہ کوئی

سرکاری دستاویز نہیں تھا، بلکہ ایک نجی تحریر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق چوں کہ خسرو اس وقت اتنے تجربہ کار اور معمر نہیں تھے کہ اتنی اہم دستاویز کے تحریر ان کے سپرد کی جاتی، پھر بھی خسرو کا یہ فتح نامہ قرون وسطیٰ کے فتح ناموں کے انداز کو پیش کرتا ہے (۱۷)۔

یہ فتح نامہ ۶۸۰ھ / ۱۲۸۱ء میں تحریر ہوا تھا۔ اس وقت خسرو کی عمر ۲۹ سال تھی (۱۸)۔ فتح نامہ کی ابتدا حمد باری تعالیٰ سے ہوتی ہے۔ پھر اس میں کہا جاتا ہے کہ بلبن نے ملک الشرق اختیار الدین باربک کو، جو دربارِ دہلی کا ایک قابل اعتماد عہدہ دار تھا اور بہادری و جواں مردی کے سبب شہرت بھی رکھتا تھا، جاج نگر اور اودھ کی بغاوتوں کو ختم کرنے اور طغرل کے تعاقب میں بھیجا تھا۔ یہ علاقے دارالحکومت سے بہت دور تھے۔ اس کے علاوہ دہلی سے وہاں تک بہت دشوار گزار راستے تھے۔ اس علاقے میں ہاتھیوں کی بہتات تھی، چناں چہ میدان جنگ میں سوار اور پیادے محفوظ رہتے تھے۔ اختیار الدین باربک (۱۹)، جسے کل اختیارات حاصل تھے، راستوں کے نشیب و فراز کو پار کرتا اس طرف روانہ ہوا۔ اس کے قریب پہنچنے پر وہاں خوف و ہراس پھیل گیا۔ لیکن مالدیو رانا، جو جاج نگر کا ایک "رائے" اور بڑا زمیندار تھا، مقابلے پر آمادہ ہوا (۲۰) اور پچاس ہاتھیوں، پانچ سو سواروں اور دس ہزار پیادوں کے ساتھ لشکر شاہی کی طرف بڑھا۔ لشکر کے جری سپاہی، جو ان دشمنوں کے خون کے پیاسے تھے، غالب رہے اور پہلے ہی حملے میں بہت سوں کو قتل کر دیا۔ چوں کہ انھیں دکنی ہاتھیوں کو قبضے میں لینے کی خاص ہدایت تھی، اس لیے انھوں نے

تقریباً سارے ہاتھی اپنے قبضے میں لے لیے۔ اس کے بعد فاتح فوج جہانبار کی طرف چلی، جو "رائے" کا مستقر تھا۔ ہر گاؤں کے مضبوط قلعے کے چاروں طرف ایک فصیل تھی اور انتہائی بلندی پر منجنقیں لصب تھیں اور کئی چھوٹے مورچے تھے۔ جہاں سے عرادے (بڑے بڑے پتھر) تیر اور نیزے پھینکے جاسکتے تھے۔ لشکر کے سپاہیوں کو مضبوط رسیوں اور سیڑھیوں کے ذریعے فصیل پر چڑھنے کا حکم دیا گیا۔ وہ یلغار کرتے ہوئے اوپر چڑھ گئے اور قلعے کے ایک حصے پر قبضہ کر لیا۔ اسی اثنا میں کہ وہ اسے تہس نہس کر دیتے، رائے براجت من نے، جو عقل مندی اور دور اندیشی کے اعتبار سے ہندوؤں میں امتیاز رکھتا تھا، اس احتیاط کے تحت کہ اس کی زمینداری کے کل وسائل تباہ و برباد ہو رہے ہیں، اپنے چند مدبر افراد کو صلح کی خاطر بھیجا۔ جب شاہی عساکر نے یہ دیکھا کہ دشمنوں کا سرگردہ اپنے بے پناہ وسائل اور سابقہ سرکشی اور خراج کی ادائیگی سے انکار کے بعد اب عاجزی سے صلح کی درخواست کر رہا ہے تو انھوں نے رائے براجت من کے تحائف کو قبول کر لیا اور اس کے بھیجے ہوئے افراد کو سلامتی اور تحفظ کی یقین دہانی کے ساتھ واپس کیا۔ چناں چہ رائے بہت مشکور ہوا اور اس نے پچاس ہاتھی اور زرد و جواہر اور قیمتی سامان اپنی وفاداری کے اظہار کے طور پر بھیجے اور اس دن کے بعد سے وہ اپنی جان و مال کی حفاظت کی طرف سے بے فکر ہو گیا۔ اس کے مال و متاع اور جواہر کا جائزہ لیا گیا اور جو کچھ اس نے دیا اسے قبول کر لیا گیا اور اس کے معروضات اور مطالبات بھی تسلیم کر لیے گئے۔ معاہدے کے تحت وہ "ذمیوں" میں شامل ہوا۔ جب اس علاقے کے

تمام معاملات قابل اطمینان حد تک طے پا گئے تو ۵۔ شوال ۶۸۰ھ / ۱۲۸۱ء کو بادشاہ دارالحکومت واپس ہوا۔

دوری اعتبار سے دوسری دستاویز حسن سجزی کے نام خسرو کا خط ہے۔ حسن سجزی خسرو کے قریبی دوست اور شاعر تھے۔ حضرت نظام الدین اولیا کے مرید اور "فوائد الفواد" (ملفوظات حضرت نظام الدین اولیاء) کے مرتب کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے ہیں۔ اپنے زمانے میں سعدی، ہند بھی کہلاتے تھے۔ برنی نے انھیں عہد علائی کے ممتاز شاعروں میں شمار کیا ہے (۲۲)۔ خسرو نے انھیں یہ خط یکم رجب ۶۸۷ھ / ۱۲۸۸ء کو لکھا تھا۔ اس خط میں مختصر طور پر بغرا خاں اور کیقباد، باپ اور بیٹے کی اودھ میں دریائے سرجو کے کنارے ملاقات کا واقعہ ملتا ہے۔ اس ملاقات کے پس منظر اور اس کی تفصیلات کو خسرو نے بڑی تفصیل کے ساتھ اپنی ایک علیحدہ منظوم تصنیف "قران السعدین" میں پیش کیا ہے (۲۳)۔ اس خط میں افراد کا تذکرہ نظام شمسی کی علامتوں میں کیا گیا ہے۔ خسرو نے اس میں اپنے قدیم احباب شمس الدین دبیر (۲۴) اور قاضی اثیر الدین (۲۵) سے دوبارہ ملاقاتوں کا تذکرہ بھی کیا ہے (۲۶)۔ اس کے علاوہ خسرو نے اس میں اپنے مربی ملک الشرق اختیار الدین علی بیگ سلطان (جان جہاں حاتم خاں) کا بھی ذکر کیا ہے، جو اودھ کا صوبہ دار مقرر کیا گیا تھا (۲۷)۔

بغرا خاں اور کیقباد کی جس ملاقات کا اس میں تذکرہ کیا گیا ہے وہ دریائے سرجو کے کنارے ہوئی تھی (۲۸)۔ پہلے دن دونوں نے ایک دوسرے کے

مقابل کناروں پر پڑاؤ کیا، اور دوسرے دن ان دونوں کے درمیان ملاقات ہوئی (۲۹)۔ خسرو وہاں کیقباد کے لشکر میں خان جہاں حاتم خاں کے ساتھ موجود تھے۔ وہ انتہائی غم اور ملال کے ساتھ لکھتے ہیں کہ وہ شاہی لشکر کے ساتھ واپس گھر نہیں آسکتے۔ انھیں اپنے آقا خان جہاں کے ساتھ اودھ ہی میں رکنا پڑے گا۔ شاہی دستہ تو واپس جارہا تھا لیکن ان کا آقا انھیں ان کے دوستوں سے جدا کر کے ہندوستان کے تیرہ تار گوشوں اور دور دراز علاقوں کی طرف لیے جارہا تھا۔ اس وقت بارش کا موسم تھا، بجلیاں چمک رہی تھیں اور اولے پڑرہے تھے۔ ان سب کے باوجود اور اپنی مرضی کے خلاف انھیں اپنا راستہ تبدیل کرنا پڑا۔ دوستوں سے جدا ہونے کے سبب ان کی آنکھیں بھی آنسو برسارہی تھیں۔

ایک دستاویز عہد علاؤالدین خلجی (۱۲۹۶ء-۱۳۱۶ء) کے ابتدائی سالوں کے واقعات سے متعلق ہے۔ اس عہد کی مختلف خصوصیات کو خسرو نے اپنے مثالی طرزِ تحریر میں "اعجازِ خسروی" کے پہلے حصہ میں اختصار سے پیش کیا ہے۔ اس کا تعارفی حصہ مبارک شاہ کی مدح سرائی پر مشتمل ہے (۳۰)، جو علاؤالدین خلجی کا بدکردار جانشین بیٹا تھا (۳۱)۔ خسرو نے علاؤالدین خلجی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کے مطابق وہ اپنی مہمات اور فتوحات کے لحاظ سے قابل تعریف ہے۔ اس کا مغلوں کے حملوں کا موثر اور مستقل انسداد، اس کی انصاف پسندی اور رحم دلی، رعایا کی معاشی خوش حالی اور ان کی فلاح و بہبود اور امن اور سلامتی کا قیام اس کے نمایاں کارنامے ہیں (۳۲)۔ اس اعتبار سے

اس کو اپنے عہد کے تمام مسلمان بادشاہوں پر فوقیت حاصل ہے۔ اس نے متعدد مواقع پر مغلوں کا موثر طور پر انسداد کیا اور انھیں، جو گرفتار ہو کر اس کے قبضے میں آئے، بڑی عبرت ناک سزائیں دیں (۳۳)۔ اس نے اپنے لشکر کے "رستموں" کو ترکستان کے افراسیابوں کو نیچا دکھانے پر مامور کیا تھا (۳۴)۔ اس نے گرفتار شدگان کی گردنیں اڑا دیں اور جو اس سزا سے بچ رہے، جنھوں نے ذرا بھی مزاحمت کی ان کے بارے میں حکم دیا کہ انھیں قلعے کی فصیل کے اوپر سے دریا میں گرا دیا جائے۔ جب کٹی ہوئی گردنوں سے بہتا ہوا خون بہنے لگا تو ان کے سرخ جسموں کو ایک ایسے بیج کی طرح، جس کے پودے سے تاتار کے سرخ خوشبو دار گل ریحان پیدا ہوں، زمین میں دفنا دیا گیا۔ اس کے بعد ان "کتوں" کی کھوپڑیوں سے، نحوست کی علامت کے طور پر مینار تعمیر کیے گئے۔ سینکڑوں کھوپڑیوں کے یہ مینار بلندی میں آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ اسی طرح سے ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی ایسے ہی بلند و بالا مینار تعمیر ہوئے۔ شہر اور دیہات جو مغلوں کے مسلسل حملوں کی وجہ سے صحرا کی مانند ویران اور برباد ہو گئے تھے، بادشاہ کی کوششوں سے پھر آباد ہو گئے۔ خون آشام مغل، غزنی کی دوسری جانب دریائے سندھ کو عبور کرنے کے قابل نہ رہے اور انھیں دوبارہ حملے کی جرأت نہ ہوئی۔ دہلی سے لے کر خراسان کے علاقوں تک امن و امان کا دور دورہ ہو گیا۔ تمام خون خرابہ اور فتنہ و فساد ختم کر دیا گیا اور مغلوں کا قلع قمع ہو گیا۔ ایک جانب تو چنگیز خان کے حملے کا جو خطرہ تھا، وہ دور ہو گیا اور دوسری جانب ہندوستان کے طاقتور راجہ، جن کے پاس

سینکڑوں ہاتھی تھے، اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ رکھتے تھے کہ اس سلطنت کو اپنے ہاتھی اور مال و دولت پیش کر دیں ۔ جنھوں نے ایسا کرنے سے انکار کیا ان کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیا گیا ۔ ان میں ان لوگوں کو، جنھوں نے سر تسلیم خم کیا، شاہی اعانت کا مستحق سمجھا گیا ۔

بادشاہوں کی اعانتیں اور مہربانیاں اس قدر عام تھیں کہ غریب اور امیر دونوں بن مانگے مالا مال ہو رہے تھے ۔ عوام سے انصاف اور ان کی فلاح و بہبود کے معاملات میں بادشاہ کی فطری خوبیوں نے ایسے ایسے قوانین تشکیل دیے تھے کہ جو نہ تو " آئینہء سکندری " میں نظر آتے ہیں اور نہ " جام جمشید " میں ۔ غلہ اور دیگر اشیاء کی قیمتوں کو ارزاں کرنے کے سلسلے میں اس کی ٹھوس اور متوازن کوششوں نے ایسے ضوابط کا نفاذ کیا کہ چاہے بارش نہ بھی ہوتی اور فصل کی تیاری میں آب و ہوا راس نہ آتی، تو بھی شاہی گوداموں کے ذریعے غلے کی مناسب اور ضروری تقسیم جاری رہتی (۳۵) ۔ جہاں تک عوام اور خواص دونوں کی ضرورتوں کا تعلق تھا، اشیاء کو وافر اور ارزاں کر دیا گیا تھا ۔ بادشاہ کو پیش کیے جانے والے نذرانے اور تحائف کا جہاں تک تعلق تھا، کوئی شخص انھیں خریدنے اور پیش کرتے ہوئے خود پر بار محسوس نہ کرتا ۔ سارے عوام آسودہ اور مطمئن تھے ۔ سلطان کی مستعد انتظامیہ کی کوششوں کے سبب ہر طرف امن اور سلامتی کا دور دورہ تھا ۔ سب کے لیے، حتیٰ کہ پردہ دار خواتین اور ان کے شیر خوار بچوں کے لیے، صاف ستھری اور محفوظ سڑکیں اور شاہراہیں تعمیر کرائی گئیں ۔ جس طرح سورج کے طلوع ہونے سے سایہ دور بھاگتا ہے،

چور اور ڈاکو گھریلو اشیاء اور مال و دولت کے سائے سے دور بھگا دیے گئے اور سلطان کا انصاف ظلم و ستم کو اس طرح ختم کرنے میں مصروف تھا، جس طرح چراغ تاریکی کو۔ دیو قامت ہاتھی چیونٹیوں کو اپنے سروں تلے روند نہ سکتے تھے اور بھوکے شیروں میں اتنی جرأت نہ رہ گئی تھی کہ ایک لنگڑے ہرن کی چال پر ہنس بھی سکتے (۳۶)۔

اسی عہد سے متعلق "اعجاز خسروی" میں ایک "فرمان" بھی موجود ہے۔ یہ "فرمان علاؤالدین خلجی" کی تخت نشینی (۱۲۹۶ء) کے بارے میں ہے (۳۷)۔ ابتداء خدا تعالیٰ کی حمد اور اس کی صفات و مہربانیوں کا اظہار ہے، پھر بادشاہت کا مقصد اور اس کی خوبیوں اور خرابیوں کا تذکرہ ہے۔ یہاں جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ علاؤالدین خلجی کس طرح تخت پر فروکش ہوا تھا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تخت نشینی میں جلال الدین خلجی (۱۲۹۰ء۔۱۲۹۶ء) کے بعض امرا کی مرضی بھی شامل تھی۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس کی تخت نشینی کے وقت بعض لوگوں نے مخالفت کی تھی اور اپنے حسد اور کینہ پروری سے رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس "فرمان" میں علاؤالدین ان افراد کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "وہ لوگ میری جنگی کارروائیوں اور مہمات سے مطمئن نہیں تھے، لیکن میری فتح اور کامیابی کو دیکھ کر سراہنے لگے (۳۸)۔ اس کے بعد "فرمان" نئے سکوں کے جاری کرنے، نیا خطبہ پڑھنے، نئے تقرر کرنے، انصاف کی یقین دہانیوں اور اس کے طریق کار ذمیوں کے تحفظ، حدودِ مملکت میں توسیع کے عزائم، قیام امن،

سب کے لیے انصاف، عوام کی فلاح و بہبود کے کاموں میں اضافہ، شاہراہوں سے ٹھگوں اور لیٹروں کا انسداد، تاکہ لوگ اپنی کھلی ہتھیلیوں پر سونا اور چاندنی رکھ کر بے فکری کے ساتھ نیند سے لطف اندوز ہوں ۔ جاسوسی اور خبر رسانی کے ایک مستعد ادارے کا قیام، کسانوں اور مزدوروں کے لیے " جن کی پیشانیوں سے گرنے والے پسینوں کے قطرے موتی بن جاتے ہیں " اور تاجروں کے لیے مراعات، اشیائے ضرورت، بالخصوص غلے کی ارزانی، خراج کی سختی میں کمی، صوفیوں، بزرگوں، عالموں، مدرسوں اور طالبِ علموں کی سرپرستی سے متعلق ہے ۔ اس سلسلے میں جو مقصد متعین کیا گیا اور جس پر زور دیا گیا وہ " خدا کی برتری کو تسلیم کرنا اور خدا کی مخلوقات سے ہمدردی اور رحم دلی کا برتاؤ کرنا " تھا ۔ آخر میں خاص طور پر ملتان کے علاقے کے باشندوں کو انصاف اور ہمدردانہ برتاؤ کی یقین دہانی کرائی گئی (۳۹)۔ ان سے جنگوں کو ختم کرنے، اندیشے، خوف، نفرت اور مخالفت اور ساتھ ہی اپنے ناممکن العمل مطالبات بھول جانے اور نئی حکومت کی کامیابی کی دعا کرنے کے لیے کہا گیا تھا (۴۰)۔

اس کے بعد تاریخی اہمیت کی حامل دستاویز ایک " توقیع " ہے، جو شہزادہ فرید خاں کو اقطاع " معبر " اور " سواحل " کی حکومت عطا کیے جانے کے بارے میں ہے ۔ شہزادہ فرید خاں کی نامزدگی کو کسی ہندوستانی مورخ نے بیان نہیں کیا (۴۱)۔ اس " توقیع " میں خدا کا شکر ادا کرنے کے بعد کہ اس نے اتنے لائق فرزند عطا کیے اور اس توقع کے اظہار کے بعد کہ وہ ملک اور قوم کی معاونت کا

ثبوت دیں گے۔ سلطان کہتا ہے کہ ملکی معاملات کا جائزہ لینا اور یہ دیکھنا کہ کہیں سرکشی اور بغاوت کے سائے تو موجود نہیں ہیں، اس کی ذمہ داری ہے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ اپنے کسی ایک بیٹے کو ملک کے اس حصے پر جو لائق افراد سے خالی ہے، نامزد کرے۔ اس نامزد شہزادے کو اس قابل ہونا چاہیے کہ جو خراج یا محصول وغیرہ دینے سے انکار کریں ان کی سرزنش کر سکے۔ معبر کے ساحلی علاقے اور ملابار کے ساحل پر واقع تمام اقطاع جو رقبے کے لحاظ سے معبر کے برابر تھے، فرید خاں کو عطا کیے گئے، جو سب سے پیارا اور خوش قسمت بیٹا اور سلطنت کے تاج کا موتی تھا، تاکہ وہ ان دونوں علاقوں اور خطہ سمندر پر اپنا اقتدار برقرار رکھ سکے۔ پھر اس کے ماتحتوں اور دیوانوں کو بت پرستی کی بنیادوں کو ختم کرنے اور سرحدی علاقوں کے عوام کی سرکشی اور بغاوت کے خلاف موثر اقدامات کرنے کی خاطر حکم دیا کہ وہ ربیع الاول ۷۱۲ھ / ۱۳۱۲ء کے بعد سے سمندر اور زمین سے حاصل ہونے والی اپنی کل آمدنی کی تفصیلات ظاہر کرتے رہیں۔ اس کے بعد تلوار کے دھنی، اہل قلم، ماہر اور تجربہ کار مزدوران عہدوں پر، جن کے وہ مستحق تھے، نامزد کیے جانے لگے۔ وہاں کے عوام اب دیکھیں کہ ان کی کشتیاں اور جہاز اب کیش اور ہرمز کی بندرگاہوں تک جانے لگے ہیں۔ قریبی جزائر، جو ان کے لیے پریشانیوں کا سبب تھے، تلوار کے زور سے قبضے میں آچکے ہیں۔ چناں چہ ان علاقوں میں بت پرستی کی رسمیں اب اسلام کے فرائض اور مستحسن روایتوں میں تبدیل ہونی چاہییں۔ جو کوئی اپنی ذمی کی حیثیت کو تسلیم کر لے اسے معاف کر دیا جائے۔

"فرمان" میں شہزادے کو بڑی تفصیلی ہدایات دی گئی ہیں (۴۲) کہ وہ کس طرح خوش اسلوبی سے اپنے معاملات کو انجام دے کہ عوام امن و سکون سے زندگی گزار سکیں۔ کس طرح وہ امن و امان قائم کر سکتا ہے، مفلسی اور غربت کو کس طرح ختم کر سکتا ہے، محرروں اور منشیوں کی دھوکہ دہی سے کس طرح بچ سکتا ہے، ہندو منشیوں کی جعل سازیوں سے جو اپنے "خط بازگما" سے مسلمانوں کے معاملات میں الجھنیں پیدا کرتے ہیں، مسلمانوں کے مفادات کا کس طرح تحفظ کر سکتا ہے۔ وہ معاشی اور فوجی استحکام کس طرح پیدا کر سکتا ہے، اور باغیوں اور سرکشوں کی سرکوبی کس طرح ہو سکتی ہے۔ ان ہدایتوں کے ساتھ ساتھ وہ اس امر پر بھی زور دیتا ہے کہ مذہب کو ہر معاملے میں رہنما ہونا چاہیے (۴۳)۔

عہد علائی کے بارے میں اگلی دستاویز ایک "فرمان طغرا" ہے جو ۱۲۔ صفر ۷۰۹ھ / ۱۳۰۹ء کو جاری ہوا تھا۔ یہ ان تاجروں کے لیے تھا جو مختلف ممالک عرب، حبش، بحرین اور شام سے سمندر کے راستے تجارت کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علاؤالدین خلجی غیر ممالک سے تجارت اور جہازرانی کو کس قدر اہمیت دیتا تھا۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ تجارت کے ساتھ ساتھ حبش اور زنجبار سے سیاہ فام افراد اور حبشی غلام ہندوستان درآمد کیے جاتے تھے، انھیں فوج میں رکھا جاتا تھا یا پھر یہ حرم کی نگرانی پر متعین ہوتے (۴۴)۔

ایک "فرمان" (۴۵) مجریہ ۷۱۶ھ / ۱۳۱۶ء سے عدلیہ کی کارکردگی اور ایک "قاضی" کے فرائض اور اس کی ذمہ داری کا علم ہوتا ہے کہ دہلی کے قاضی

ممالک شمس العلماء المجتہدین ضیاء الحق والدین عبدالرحمن عثمان اشرف مقرر ہوئے تھے۔ ان کے بارے میں آگے چل کر علاؤالدین لکھتا ہے کہ ایک ایسا شخص، جس میں قاضی ممالک ہونے کی کل صلاحیتیں موجود ہوں، جو دور اندیش ہو، گہرا اور وسیع علم رکھتا ہو، ہر طرح سے ایمان دار اور شریعت پر سختی سے کاربند ہو اور جو آسانی سے مل ہنیں سکتا تھا، بالآخر عبدالرحمن اشرف کی صورت میں مل گیا۔ جن کے پاس حضرت ابوبکرؓ کی صداقت، حضرت عمرؓ کا انصاف، حضرت عثمانؓ کی معصومیت، حضرت علیؓ کا علم تھا (۴۶)۔

ایک دستاویز دراصل "جامعہ کاغذی مظلومان" (۴۷) کے بیان پر مشتمل ہے۔ یہ شکایت صدر جہاں ضیاء الحق والدین کی خدمت میں خطہ ناگور کے ایک "حاکم" کے ایک عامل قاضی بہاسوتی کے خلاف پیش کی گئی تھی۔ چناں چہ یہ "دیوان المظلومین" میں زیر بحث آئی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ "والی" جو مسلمان ہے اور اس کا نام ملک اسلام ہے، غیر اسلامی افعال سرزد کرتا ہے۔ پھر اس میں اس کے اعمال قبیحہ گنائے گئے ہیں (۴۸)۔

اس شکایت نامے کے بعد قاری لطیف مسعود کی تیار کردہ قاضیوں کی ایک فہرست ہے، جس میں اچھے اور برے قاضیوں کے نام درج ہیں۔ قاری لطیف مسعود کا "قاری" کی حیثیت سے شیخ الاسلام رفیع الدین نے تقرر کیا تھا، جن کی وہ اس فہرست میں تعریف کرتا ہے (۴۹)۔ اس فہرست میں جو ۶۹۰ھ / ۱۲۹۱ء میں مرتب ہوئی تھی، متعدد قاضیوں کے نام ملتے ہیں۔ ان میں ایک نام قاضی ضیاء الدین کا ہے (۵۰)۔ یہ قاضی ظہیرالدین کے شاگرد تھے، جو عدلیہ

کے نظم و ضبط میں سختی کے قائل تھے (۵۱)۔ قاضی صدر الدین، جو برسوں نائب قاضی ممالک کے عہدے پر فائز رہے، صدر جہاں مقرر ہوئے (۵۲)۔ قاضی جلال الدین (۵۳)، قاضی محمد یوسف، قاضی ممالک عین الدین، جو ہمیشہ شریعت پر کاربند رہتے تھے، قاضی برہان الدین جو ہمیشہ استدلال پیش کرتے، قاضی احمد جو تمام قاضیوں میں معتبر تھے ۔ ان کے علاوہ بھی فہرست میں اور قاضیوں کے نام درج ہیں، جیسے قاضی جعفر خان، جن کی کوئی عزت اور وقار نہیں تھا، قاضی امام الدین رازی جو فتنہ پرور تھے، قاضی کمال الدین، جو دوسروں کے مال کو خرد برد کرنے میں مشہور تھے، قاضی یعقوب کافی امیر تھے (خدا کرے وہ مرجائے اور اس کی دولت لٹ جائے)، قاضی وحید الدین، جو منافق تھے، قاضی رضی الدین، جو لوگوں کے دلوں کو دکھاتے تھے، قاضی مودود، جو پہلے ہی جہنم رسید ہو چکے ہیں، قاضی بہاء سوتی جو بازاروں میں مشق ستم کرتے تھے (۵۴)، قاضی خالد، جھوٹے اور بدمعاش، جو مرچکے ہیں (۵۵)۔

ایک دستاویز سے، جو ۷۰۰ھ / ۱۳۰۰ء میں جاری ہوئی تھی، یہ پتہ چلتا ہے کہ دہلی کے مشرق میں ایک گاؤں جس کا نام لسور (فسور) تھا، (کسی) جنگ کے سبب تباہ و برباد اور ویران ہو گیا اور انعام کے طور پر شیخ شمس الدین کو اس ہدایت کے ساتھ دیا گیا کہ وہ اسے دوبارہ آباد کریں اور اسے بارونق بنا دیں ۔ گاؤں کے باشندوں کو بھی ہدایت کی گئی کہ شیخ شمس الدین کو گاؤں کا متصرف سمجھیں اور سال بھر کے محاصل ان کو ادا کریں اور ان کے احکام کی تعمیل کریں (۵۶)۔

مورخہ ۲ - ربیع الاول ۷۰۹ھ / ۱۳۰۹ء کو جاری ہونے والی ایک تحریر سے، جسے کسی بے نام عاملِ حکومت نے جاری کیا تھا، نظم عامہ میں ہونے والی بدعنوانیوں اور عمال حکومت کی کوتاہیوں سے واقفیت ہوتی ہے (۵۷)۔

آخر میں ایک اہم خط کا ذکر کیا جاسکتا ہے جسے بدر حاجب نے شہزادہ شمس الدین خضر خاں کو، جو سلطان علاؤالدین خلجی کا سب سے بڑا بیٹا تھا، بھیجا تھا۔ یہ خط غزنی کی جانب خلجیوں کی فوج کشی کے بارے میں ہے۔ حاجب اس میں لکھتا ہے کہ "شاہی احکام کے مطابق میں کئی مراحل طے کرتا ہوا اور راستے میں ٹھگوں اور لیٹروں کا صفایا کرتا ہوا اپنے سفر پر آگے بڑھتا جارہا ہوں، تاکہ شاہی دستے میرے بعد آسانی سے راستہ طے کر سکیں۔ خشکی کا سفر طے کر کے میں دو مہینے بعد دریا (سندھ) کے کنارے پہنچا اور کشتیوں کے ذریعے اسے پار کیا۔ سردیوں کے موسم میں غزنی پہنچا۔ موسم بہت زیادہ سرد تھا۔ میں نے وہاں کمینہ بوغا اور دوسرے مغلوں کو دیکھا جو اسلامی لشکر کے پہنچنے پر چوکنے ہوگئے تھے۔ جب ان کے سامنے شاہی فرمان پڑھا گیا تو انھیں اطمینان ہوا۔ پھر انھوں نے اپنے رواج کے مطابق اظہارِ فرماں برداری کی خاطر اپنے سر جھکا لیے اور گھٹنے زمین پر ٹکا دیے۔ جیسا کہ فرمان کا مقصد تھا کہ وہ علاؤالدین خلجی کی اطاعت قبول کر لیں اور خطبے میں اس کا نام شامل کر لیں، یہ مقصد پورا ہوا۔ ان لوگوں نے جنھوں نے کہ اس علاقے میں سلطان کی اطاعت سے انحراف کیا تھا، وہ دوبارہ اس کے مطیع ہوگئے اور جو مسلمان ان سرکش مغلوں سے خائف ہو کر پہاڑوں میں چھپ گئے تھے، اپنی اپنی پناہ گاہوں سے باہر نکل

آئے۔چناں چہ غزنی کا سارا علاقہ مذہب کی روشنی سے منور ہو گیا۔ یہ سنیچر کا دن تھا۔اس دن پہلے پہل غزنی کے خطیب نے آئندہ سے سلطان کے نام کا خطبہ پڑھنے کی خوشخبری سنائی۔ وہ یہ اعلان کرتے ہوئے بہت خوش نظر آرہا تھا اور یوں لگتا تھا کہ یہ پانچ دن اس کے لیے بہت بھاری ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ جلد سے جلد جمعے کا دن آجائے۔جمعے کے دن "علائی" خطبہ سننے کی توقع میں غزنی کے علما اور صوفیا جو ایک عرصے سے دہلی کی سمت دیکھ رہے تھے اور چھوٹے بڑے سب ایک دوسرے سے اپنی اپنی خوشیوں کا اظہار کر رہے تھے، میں نے دیکھا کہ خطیب نے اپنے بازو پر شاہی تمغہ لگا رکھا ہے، جو اسے خلیفہ وقت سے ملا تھا غزنی کی جامع مسجد جو بہت بوسیدہ ہو چکی تھی اور جس کی دیواریں اور دروازے گر چکے تھے، اب اس کی حالت درست ہو گئی ہے اور پھر نمازیوں کا مرکز بن گئی ہے۔ جو لوگ خدا کا نام بھولتے جا رہے تھے۔ وہ اذان کی آواز سن کر اب پھر یہاں جمع ہونے لگے۔ خطیب نے خطبہ شروع کیا اور جب بادشاہ سلامت کا نام آیا تو میں نے زر و جواہرا چھالے جس پر لوگ ٹوٹ پڑے۔ مغلوں نے یہ سب منظر اوپر دیواروں پر چڑھے للچائی نظروں سے دیکھا۔اس خطبے کی برکت سے اس علاقہ میں اسلام کا سکہ جم گیا اور بہت سے باشندے اسلام پر ایمان لے آئے۔

خط کے آخر میں بدر حاجب نے خراسان اور وسط الیشیا کے مغلوں کے مابین فرقہ بندیوں اور لڑائیوں کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ لوگ جو پہلے متحد تھے، اب دو گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ انتشار، جنگیں اور فسادات اس علاقے میں

بڑھ گئے۔ غزنی اور دریائے سندھ کے درمیان رہنے والے باشندوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ افغان کوہِ سلیمان کی طرف فرار ہو گئے اور وہاں روپوش ہو گئے۔

بدر حاجب نے یہ بھی لکھا کہ جب وہ وہاں سے واپس آنے لگا تو بوغا نے ایک بڑی عالی شان ضیافت کا اہتمام کیا اور اس کے ساتھ ایک ہزار تاتاری گھوڑے، ایک ہزار ترکی لڑکیاں اور روسی کتان کے پانچ سو تھان خضر خاں کے لیے تحفے میں دیے (۵۸)۔

حواشی:

(۱) خسرو "اعجاز خسروی" (نولکشور، ۱۸۷۶ء) رسالہ چہارم، ص ۳۴۲؛ رسالہ پنجم، ص ۱۶۷۔

(۲) اس کے نثری محاسن اور اس کے موضوعات کا ایک اچھا مطالعہ وحید مرزا
"LIFE AND WORKS OF AMIR KHUSRAU"
(پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ ۱۹۶۲ء) ص ۲۱۶۔۲۲۱؛ "امیر خسرو" (الہ آباد۔ ۱۹۴۹ء) ص ۳۰۲۔۲۰۹
میں ہے۔

(۳) جیسے "پی۔ہارڈی
"HISTORIANS OF MEDEIVAL INDIA" (لندن، ۱۹۶۰ء) ص
۸۹۔

(۴) خسرو "اعجاز خسروی" رسالہ اول، ص ۶۴۔۶۵، نیز اسلوب کے ضمن میں خسرو کے نظریات کے لیے وحید مرزا "LIFE AND WOKS....." ص ۲۱۶۔۲۱۷۔

(۵) خسرو "اعجاز خسروی" رسالہ اول، ص ۶۵۔

(۶) سید حسن عسکری "MATERIAL OF HISTORICAL INTEREST IN IJAZ-I KHUSRAVI"
منقول "MEDEIVAL INDIA A MISCELLANY, VOL-I"
(علی گڑھ۔ ۱۹۶۹ء) ص ۲۔

(۷) خسرو "اعجاز خسروی" رسالہ چہارم، ص ۴۔۱۳۔ اس فتح نامے کا مختصر تذکرہ ڈاکٹر حبیب اللہ نے اپنی تصنیف میں کیا ہے۔
"FOUNDATION OF MUSLIM RULE IN INDIA"
(لاہور۔ ۱۹۴۵ء) میں ۱۶۷ح؛ اس کو خلیق احمد نظامی نے اپنی مؤقر تصنیف
"SOME ASPECTS OF RELIGION AND POLITICS IN INDIA, DURING THE THIRTEENTH CENTURY"
(بمبئی ۱۹۶۱ء) میں بطور ضمیمہ (۱۱) اپنے تبصرے کے ساتھ شائع کیا ہے، ص ۳۴۱۔۳۴۶۔

(۸) خسرو "اعجاز خسروی" رسالہ چہارم، ص ۴

(۹) ضیاء الدین برنی "تاریخ فیروز شاہی" اردو ترجمہ (لاہور ۱۹۶۹ء) ص ۱۵۲۔

(۱۰) ایضاً، ص ۱۵۲-۱۵۳

(۱۱) ایضاً، ص ۱۵۳؛ بعد کے مؤرخین نے معزالدین کے بجائے مغیث الدین تحریر کیا ہے۔ ایشوری پرشاد "HISTORY OF MEDEIVAL INDIA" (الہ آباد، ۱۹۳۳ء) ص ۱۵۸؛ عسکری ص ۲؛ طغرل نے یہ بغاوت اس وقت کی تھی جب بلبن بیمار تھا اور اس کے دونوں بیٹے سلطنت کی سرحدوں پر مغلوں کے حملوں کو روکنے میں مصروف تھے۔ یحییٰ بن احمد سرہندی کے مطابق ۱۲۸۱ء میں جب بلبن بیمار تھا تو یہ خبر مشہور ہو گئی کہ وہ فوت ہو گیا ہے۔ طغرل نے یہ خبر سن کر بغاوت کی تھی۔ "تاریخ مبارک شاہی" (کلکتہ، ۱۹۳۱ء) ص ۴۰-۴۱۔ لیکن اسٹوارٹ نے اپنی تصنیف "HISTORY OF BENGAL" میں لکھا ہے کہ خود طغرل نے بلبن کی وفات کی خبر اڑائی تھی۔ ص ۹۱۔ بحوالہ ایشوری پرشاد۔ تصنیف مذکور، ص ۱۸۴ح۔

(۱۲) تفصیلات کے لیے برنی، ص ۱۵۴-۱۵۵۔ ایشوری پرشاد، ص ۱۵۸ اور وی۔ ڈی۔ مہاجن۔ "THE MUSLIM RULE IN INDIA" (دہلی، ۱۹۶۲ء) ص ۶۳ نے امین خاں کا نام امیر خاں تحریر کیا ہے۔

(۱۳) برنی ۱۵۶؛ اسٹیلے لین پول "MEDEIVAL INDIA" (لندن، ۱۹۱۷ء) ص ۸۵۔

(۱۴) برنی، ص ۱۵۸-۱۶۴

(۱۵) خسرو "دیباچہ غرۃ الکمال" (دہلی، بار اول) ص ۲۷۔

(۱۶) برنی ص ۱۶۵-۲۶۷؛ ملک قوام الدین دبیر، کیقباد کے عہد میں عمدۃ الملک اور نائب وکیل دربار ہو گئے تھے۔ ایضاً ص ۲۲۱۔ معزی حکومت کے ستون تھے۔ اگر یہ کیقباد کے عمائد میں نہ ہوتے تو اس کی حکومت اپنے ارکین کی مصروفیت اور آپس کی تفرقہ بازیوں کے ساتھ ایک ہفتے بھی قائم نہ رہتی۔ یہ رائے، تدبیر اور کارکردگی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ہنرمند اور ہنرپرور بھی تھے۔ ایضاً، ص ۲۶۷؛ فضل و بلاغت، انشا پردازی اور مخصوص طرز تحریر کے ایجاد کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ایضاً ص ۲۲۱؛ دبیری و سردبیری میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ اگر بہاء الدین بغدادی، رشید وطواط، معین اصم، جو قدیم زمانے میں مشہور دبیر اور منشی گزرے ہیں، ملک قوام الدین کی مراسلت دیکھتے تو تعجب سے انگشتِ حیرت دانتوں میں دبا لیتے۔ ایضاً ص ۲۶۷۔

(۱۷) تصنیفِ مذکور، ص ۳۴۱

(۱۸) خسرو ۱۲۵۳ء / ۶۵۱ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ وحید مرزا "LIFE AND WORK....." ، ص ۱۷۔

(۱۹) اسے برنی نے "ملک اختیار الدین بیکترس سلطانی" باربک لکھا ہے، ص ۶۹؛ اور ملا عبدالقادر بدایونی نے "ملک اختیار برلاس" تحریر کیا ہے۔ "منتخب التواریخ" اردو ترجمہ (لاہور، ۱۹۶۲ء) ص ۸۰۔

(۲۰) خسرو نے جو واقعات قلم بند کیے ہیں وہ بعینہٖ کسی معاصر تاریخ میں موجود نہیں۔

(۲۱) خسرو "اعجاز خسروی" رسالہ پنجم، ص ۵ - ۱۳، خلیق احمد نظامی، تصنیف مذکور، ص ۳۴۲-۳۴۵۔

(۲۲) برنی، ص ۵۲۲-۵۲۳۔

(۲۳) یہ تصنیف بجائے خود ایک تاریخی شاہکار ہے۔ اس کے جائزے کے لیے مولانا اسمٰعیل میرٹھی، مقدمہ "مثنوی قران السعدین" (علی گڑھ، ۱۹۱۸ء) و نیز سید حسن برنی، تعارف، ایضاً؛ سید صباح الدین عبدالرحمن "بزم مملوکیہ" (اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء) ص ۳۳۳-۳۴۰؛ ہارڈی، ص ۷۱۔

۶۷

(۲۴) شمس دبیر کا وطن سنام تھا۔ فرشتہ "تاریخ فرشتہ" جلد دوم (نولکشور، ۱۹۳۱ء) ص ۳۸۹؛ مولانا سید عبدالحئی نے ان کا شمار ممتاز علماء اور شعرا میں کیا ہے۔ "نزہتہ الخواطر" جلد دوم (لاہور، ۱۹۶۵ء) ص ۸۲؛ ملا عبدالقادر بدایونی نے ان کو سلطان ناصر الدین محمود کے عہد کا "ملک الکلام" قرار دیا ہے۔ ص ۷۷؛ سلاطین دہلی کے دربار سے وابستہ ہوئے تو "دبیر" کے فرائض انجام دیتے رہے۔ چناں چہ وہ شمس دبیری کے نام سے معروف ہوئے۔

(۲۵) قاضی اثیر الدین اس زمانے کے ایک بزرگ اور بلند پایہ شاعر اور شمس دبیر اور خسرو کے مقرب تھے۔ خسرو نے ان کا ذکر بڑی عقیدت اور محبت کے ساتھ کیا ہے۔ جیسے "دیباچہ دیوان غرۃ الکمال"، ص ۷۰

(۲۶) یہ تذکرہ ایضاً، ص ۷۰-۷۱ میں بھی موجود ہے۔

(۲۷) برنی ص ۲۸۵

(۲۸) بلبن کی وفات کے بعد دہلی کے تخت پر اس کے بیٹے ناصر الدین محمود بغرا خاں کے بجائے

اس کا پوتا یعنی بغرا خاں کا بیٹا معزالدین کیقباد ۶۸۶ھ / ۱۲۸۷ء میں متمکن ہوا تھا۔ برنی نے ۶۸۵ھ / ۱۲۸۶ء لکھا ہے۔ (ص ۲۱۵)، جو درست نہیں۔ عصامی "فتوح السلاطین" (آگرہ، ۱۹۳۸ء) ص ۱۸۰؛ یحییٰ سرہندی، ص ۵۲؛ اس کی مزید تائید قران السعدین میں خسرو کے اس شعر سے ہوتی ہے۔

کرد چو در شش صد و ہشتاد و شش

بر سر خود تاج جدِ خویش خوش

بغرا خاں لکھنوتی میں بدستور خود مختار آزاد حکمراں بنا رہا۔ تخت نشینی کے وقت کیقباد کی عمر سترہ اٹھارہ برس تھی۔ جب تک بلبن کے زیر سایہ رہا، اس کو لہو و لعب سے دور رکھا گیا۔ لیکن جب تخت پر بیٹھا تو اس کا رنگ ڈھنگ بالکل ہی بدل گیا۔ اس کی عیاشیوں کی داستان برنی نے بڑی تفصیل کے ساتھ تحریر کی ہے، ص ۲۱۷۔ ۲۲۰۔ خود خسرو نے "قران السعدین" اور "غرۃ الکمال" میں ان محفلوں کے رنگ ڈھنگ کو پر کشش انداز میں نظم کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی غزل بھی نمائندہ ہے، جس کا مطلع ہے:

اے دہلی! وائے بتانِ سادہ

پگ بستہ و عریشہ کج نہادہ

ان عیاشیوں کی آڑ میں ملک نظام الدین باربک سلطنت کا مختار کل ہو گیا، برنی ص ۲۲۱؛ بغرا خاں کو بیٹے کی بے راہ روی کی خبریں موصول ہوتیں تو اس کو بڑا دکھ ہوا۔ اس نے بیٹے کو شفقت آمیز خطوط لکھ کر غفلت سے بیدار کرنا چاہا، لیکن بیٹے پر ان کا اثر نہ ہوا۔ چناں چہ باپ نے جب صورت حال بگڑتے دیکھی تو بیٹے کو راہِ راست پر لانے کی خاطر ایک لشکر لے کر لکھنوتی سے اودھ کی طرف چلا۔ اس کا مقصد لشکر کشی نہ تھا۔ لیکن ملک نظام الدین چوکنا ہوا اور وہ بھی کیقباد کی آڑ میں ایک فوج کے ساتھ دہلی سے اودھ کی طرف روانہ ہوا۔ کیقباد بادل ناخواستہ اپنے عشرت کدے سے نکل کر لشکر کے ساتھ چلا اور گنگا عبور کرکے دریائے سرجو کے قریب جا پہنچا۔ دریا کی دوسری جانب بغرا خاں کی فوج تھی۔ تفصیلات کے لیے خسرو "قران السعدین" (لکھنؤ، ۱۲۶۱ھ)

(۲۹) کیقباد جب اپنے باپ بغرا خاں سے مل کر دہلی واپس جانے لگا تو حاتم خاں کو اودھ کا صوبہ دار مقرر کیا اور خسرو کو بھی اپنے آقا حاتم خاں کے ساتھ اودھ ہی میں ٹھہرنا پڑا۔

(۳۰) رسالہ اول، ص ۲۸۔ ۳۹

(۳۱) اس کی تائید برنی کے بیانات سے بھی ہوتی ہے۔ ص ۵۵۴۔ ۵۶۰، ۵۶۸۔ ۵۷۱۔

(۳۲) یوں تو خسرو نے ملک چھجو، شہزادہ محمد، حاتم خاں، بلبن، بغرا خاں، کیقباد، جلال الدین خلجی، مبارک خلجی، غیاث الدین تغلق وغیرہ کی مدح سرائی کی تھی لیکن اب سب قصیدوں کا اگر موازنہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ علاؤ الدین خلجی کی تعریف میں جو قصیدے لکھے گئے ہیں وہ جذبات کی فراوانی اور تاثیر میں بے مثال ہیں۔ خلیق احمد نظامی "سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات" (دہلی ۱۹۵۸ء) ص ۔ ۳۵۹؛ ان قصائد کے لیے "کلیاتِ خسرو" (تہران، ۱۲۴۶ف) ص ۵۸۸۔۵۹۱؛ "آئینہ سکندری" (دہلی، بار اول) ص ۱۴؛ "مطلع الانوار" (علی گڑھ، ۱۹۲۶ء) ص ۲۴۔۲۷۔۲۹ "مجنوں و لیلیٰ" (ماسکو ۱۹۶۵ء) ص ۲۴۔۳۰۔ "خزائن الفتوح" میں بھی جابجا علاؤ الدین کی مدح کی گئی ہے۔ جیسے (علی گڑھ، ۱۹۲۷ء) ص ۲۷؛ اس موضوع کے جائزے کے لیے، بارڈی، ص ۷۶، ۸۲، ۸۸، ۸۹۔

(۳۳) برنی، ص ۳۷۵۔۳۷۶، ۳۷۹۔۳۹۰، ۴۴۰۔۴۴۶؛ بدایونی، ص ۹۶۔۹۸؛ فرشتہ، جلد اول، ص ۱۶۳۔۱۶۶؛ نے ان حملوں اور ان کی پسپائی کا تذکرہ کیا ہے۔

(۳۴) اس کا ایک اندازہ "اعجاز خسروی" رسالہ چہارم، ص ۱۴۴۔۱۵۶ میں شامل ایک اور دستاویز سے بھی ہوتا ہے۔ اس دستاویز کا تذکرہ زیرِ نظر صفحات میں آگے موجود ہے۔

(۳۵) غلہ اور دیگر اشیاء کی قیمتوں کی ارزانی کے لیے برنی ص ۴۴۶۔۴۵۳؛ کپڑوں اور دوسری اشیاء کے لیے ایضاً ۴۵۳۔۴۵۸؛ گھوڑوں اور چوپایوں کے لیے ص ۴۵۸۔۴۶۰؛ منصوبے کو کامیاب بنانے کی غرض سے چند ضابطوں کے نفاذ کے لیے ص ۴۶۳۔۴۶۸؛ قیمتوں کا ایک جائزہ ایڈورڈ تھامس "THE CHRONICLES OF THE PATHAN KINGS OF DELHI" (لاہور، ۱۹۷۵ء) ص ۱۶۰۔۱۶۱۔ وبعدہ؛ الشوی پرشاد، ص ۲۳۹۔۲۴۲؛ کے ایس لال "HISTORY OF THE KHILJIS" (لندن، ۱۹۶۷ء) ص ۱۹۸۔۲۱۷ میں ہے مؤخر الذکر تصنیف خاصی تفصیلی ہے۔

(۳۶) "اعجاز خسروی" رسالہ اول، ص ۱۵۔۲۲

(۳۷) مشمولہ ایضاً، رسالہ چہارم، ص ۱۰۴

(۳۸) برنی نے بھی اس امر کی تائید کی ہے کہ جلالی امراء جن کی امداد اور وفاداری پر حکومت

دہلی اعتماد کر سکتی تھی، اب علاؤ الدین کے ساتھ ہو گئے، ص ۳۶۷-۳۶۸۔

(۳۹) ملتان، علاؤ الدین کی تخت نشینی تک جلال الدین خلجی کے بیٹوں اور امراء کا گڑھ بن گیا تھا۔ ان امراء کی سرپرستی ارکلی خان کر رہا تھا۔ اپنے ابتدائی عہد میں ہی علاء الدین خلجی نے سلطان جلال الدین کے بیٹوں کے خلاف مہم بھیجنے کو سب پر مقدم خیال کیا اور الغ خان اور ظفر خاں کی سرکردگی میں ایک فوج اس مہم کے لیے نامزد کی۔ فوج ملتان پہنچی اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ ایک دو مہینے تک یہ محاصری جاری رہا۔ ملتان کا کوتوال اور وہاں کے بیشتر افراد جلال الدین کے بیٹوں کے خلاف ہو گئے اور بعض امراء بھی آکر الغ خاں اور ظفر خاں سے مل گئے۔ سلطان جلال الدین کے بیٹوں نے شیخ الاسلام شیخ رکن الدین کو درمیان میں ڈالا اور الغ خاں سے امان چاہی۔ الغ خاں نے ملتان سے دہلی کو فتح نامہ بھیجا۔ تفصیلات کے لیے برنی، ص ۲۷۳ وبعدہ؛ ایشوی پرشاد، ص ۲۱۲-۲۱۳۔

(۴۰) خسرو "اعجاز خسروی" رسالہ چہارم۔ ص ۱۰۴-۱۱۹؛ اس فرمان کا ترجمہ تلخیص کے ساتھ عسکری ص ۶-۸ میں ہے۔

(۴۱) صرف وصاف نے اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے۔ "تاریخ وصاف" ص ۵۲۵، بحوالہ کے ایس لال، تصنیف مذکور، ص ۲۴۹ ح۔

(۴۲) انھیں عسکری ص ۹-۱۰ پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

(۴۳) تفصیلات کے لیے خسرو "اعجاز خسروی" رسالہ چہارم ص ۱۱۴-۱۱۹؛ ونیز عسکری ص ۹-۱۰۔

(۴۴) ایضاً، ص ۱۰-۱۱۔

(۴۵) یہ سارا فرمان خسرو "اعجاز خسروی" رسالہ دوم، ص ۲-۱۷؛ عسکری، ص ۱۱-۱۲ میں ہے

(۴۶) ان کا ذکر عام نہیں ہے۔ یہ شاید مولانا ضیاء الدین بیانہ تھے۔ جو اولاً قاضی لشکر تھے اور علوم و فنون سے آراستہ۔ برنی، ص ۵۱۲۔

(۴۷) یہ روایت دراصل ایرانی ہے۔ جس کا حوالہ غالب نے اپنے اس شعر میں دیا ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

(۴۸) تفصیلات کے لیے خسرو "اعجاز خسروی" رسالہ دوم، ص ۲۱-۲۵۔

(۴۹) یہ شاید قاضی رفیع الدین گازرونی تھے، جن کے بارے میں برنی لکھتا ہے کہ درس دینے اور فتاویٰ کے جواب لکھنے میں معتبر سمجھے جاتے تھے، ص ۱۹۳ ۔ و نیز سید عبدالحئی "نزہتہ الخواطر" جلد اول (لاہور، ۱۹۶۵ء) ص ۲۲۹ ۔

(۵۰) جو شاید قاضی ضیاء الدین بیانہ تھے ۔ ان کا ذکر برنی نے کیا ہے، ص ۵۲۱ ۔

(۵۱) قاضی ظہیر الدین فقہ و اصول فقہ اور ادب عربی میں ممتاز الافاضل تھے ۔ دہلی میں بلبن کے عہد میں ان کا فیضان تدریسی جاری تھا ۔ برنی، ص ۱۹۳؛ سید عبدالحئی، جلد اول، ص ۲۴۸ ۔

(۵۲) برنی، ص ۵۱۲

(۵۳) یہ شاید قاضی جلال الدین والوالجی تھے، جنھیں علاء الدین خلجی نے دہلی میں نائب قاضی ممالک متعین کیا تھا ۔ برنی، ص ۵۱۲؛ سید عبدالحئی، جلد دوم ص ۳۹ ۔

(۵۴) یہ وہی شخص ہے، جس کے خلاف پچھلی دستاویز میں لوگوں کی شکایات ملتی ہی ۔

(۵۵) خسرو "اعجاز خسروی" رسالہ دوم، ص ۲۵ ۔ ۲۸

(۵۶) ایضاً، ص ۱۷ ۔ ۱۸ ۔

(۵۷) ایضاً، ص ۴۰ ۔ ۴۹؛ نیز عسکری، ص ۱۶ ۔ ۱۸

(۵۸) یہ خط "اعجاز خسروی" رسالہ چہارم، ص ۱۴۴ ۔ ۱۵۶ میں شامل ہے ۔

قران السعدین کی تاریخی حیثیت

امیر خسرو نے "قران السعدین" رمضان ۶۸۸ھ / ۱۲۸۹ء میں مکمل کی تھی (۱) جب کہ اس وقت ان کی عمر ۳۶ سال تھی۔ لیکن اس کے خاتمے کا پہلا حصہ انھوں نے بعد میں اضافہ کیا۔ اس وقت ان کی عمر چالیس اور پچاس سال کے درمیان تھی (۲)۔ خسرو نے یہ مثنوی سلطان معزالدین کیقباد (۱۲۸۷ء - ۱۲۹۰ء) کی فرمایش پر لکھی تھی۔ وہ اس وقت تک اپنے دواوین "تحفۃ الصغر" اور "وسط الحیٰوۃ" میں اساتذہ کے رنگ میں قصائد اور غزلیں کہہ کر اپنا کمالِ فن ثابت کر چکے تھے۔ انھوں نے بعض مختصر مثنویاں تو کہی تھیں، لیکن اب تک کوئی طویل مثنوی ہنیں لکھی تھی۔ نظامی گنجوی کی مثنوی کو پسند بھی کرتے تھے اور اس سے مرعوب بھی تھے، لیکن اس فن کو اختیار کرنا کارے دارد بھی سمجھتے تھے:

در ہوس مثنویت در دل است
حل کنم این بر تو کہ بس مشکل است
در روشی کز تو نیاید مرد
گفت بدم مشکو و نیکو شنو

نظم نظامی بہ لطافت چو در

وز در او سر بسر آفاق بر

بگذر ازیں خانہ کہ جائے تو نیست

وین رہ باریک بپائے تو نیست (۳)

پھر بھی سلطان معزالدین کیقباد کی خواہش پر انھوں نے اس فن میں بھی طبع آزمائی کی اور چھ مہینے کی لگاتار مشقت کے بعد تین ہزار نو سو چوالیس اشعار کی ایک مثنوی لکھی اور "قران السعدین" نام رکھ کر کیقباد کی خدمت میں پیش کی (۴)۔ ابتداً، وہ اس مثنوی کو لکھنے میں تذبذب محسوس کرتے تھے، لیکن جب لکھ چکے تو فخر و انبساط محسوس کرنے لگے:

دید چوں ایں مثنوی بیش را

تیر تسلیم کرد سر خویش را

ہریک ازیں بیت کہ ہیئت و فن ست

شد خوشا دل کہ چو جنت خوش ست (۵)

وہ اپنی خوشی اور مسرت کے اظہار میں حق بجانب تھے (۶) کیوں کہ یہ مثنوی اپنی جدتِ طبع، واقعہ نگاری، سحربیانی، وصف نگاری، تخیل آفرینی، تمثیل نگاری اور لفظی صنعت گری کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے (۷)۔ خسرو کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ایک غیر دل چسپ اور خشک واقعے کو مثنوی میں نظم کیا تھا۔ ان کے سامنے متعدد مشکلات تھیں۔ طویل مثنوی لکھنے کی نہ انھیں مشق تھی نہ مہارت۔ پھر واقعے کے پلاٹ میں کوئی دل آویزی اور

رومانیت بھی نہیں تھی ۔ لیکن بالآخر انھوں نے اپنی جدتِ طبع اور فنی صنعت گری سے تمام مشکلات پر قابو پا لیا ۔ ان کی یہ مثنوی نہ صرف ایک عیش پرست اور رنگیلے مزاج بادشاہ کو پسند آئی بلکہ ایک اہم ادبی شاہکار اور تاریخی مآخذ بھی بن گئی (۸)۔

خسرو نے یہ مثنوی کیقباد کی فرمائش پر لکھی تھی جو اس وقت ان کا مربی تھا ۔ اس سے قبل خسرو، علاؤ الدین، کشلی خاں (ملک چھجو)، بغرا خاں اور شہزادہ محمد سلطان کے دامن دولت سے وابستہ رہ چکے تھے ۔ کشلی خاں، سلطان بلبن کا بھتیجا اور اس کے دربار کا باربک تھا (۹)۔ خسرو دو سال تک اپنی سخن سنجی اور نغمہ سرائی سے اس کو محظوظ کرتے رہے (۱۰)۔ پھر اس سے علیحدہ ہو کر بغرا خاں کے پاس سامانہ چلے گئے۔ جہاں بغرا خاں نے ان کو اپنا ندیم خاص بنا کر ان کی بڑی عزت کی ۔ احسان شناسی میں خسرو نے اس کی شان میں بھی قصیدے کہے (۱۱)۔ ۶۷۸ھ / ۱۲۷۹ء میں بغرا خاں اپنے باپ بلبن کے ساتھ طغرل کی بغاوت کو کچلنے لکھنوتی گیا تو خسرو بھی اس کے ساتھ تھے (۱۲)، لیکن انھیں وہ جگہ پسند نہ آئی ۔ چناں چہ یہ بلبن کے ساتھ دہلی واپس چلے آئے اور شہزادہ محمد کے ندیم خاص بن گئے ۔ اس کے ساتھ وہ پانچ سال تک رہے (۱۳)، لیکن لاہور میں اس کی شہادت کے بعد دہلی اور پٹیالی میں جا کر گوشہ نشین ہو گئے (۱۴)۔ جب معزالدین کیقباد تخت نشین ہوا تو اس موقع پر انھوں نے اس کی مدح میں ایک ترجیع بند کہا، جس میں سات بند ہیں ۔ کیقباد نے تخت نشینی کے بعد دربار کی ملازمت کے لیے خسرو کو طلب کیا ۔ لیکن نظام الدین

باربک، جو دراصل کیقباد کی کم سنی اور عیاشی کی آڑ میں سلطنت کا مختار کل ہوگیا تھا (۱۵)، خسرو سے بدظن تھا (۱۶)۔ چناں چہ خسرو نے معزی دربار سے وابستگی پسند نہ کی اور حاتم خان خان جہاں کی منادمت اختیار کر لی۔ جس نے ان کو لطف و کرم اور مال و دولت ہر طرح سے نوازا (۱۷)۔ وہ اس کے ساتھ دو سال تک اودھ میں رہے اور جب کیقباد نے اپنے باپ بغرا خاں سے اودھ میں دریائے سرجو کے کنارے ملاقات کی ہے تو اس وقت خسرو بھی اپنے آقا حاتم خاں کے ساتھ موجود تھے۔ بعد میں اسی ملاقات کا واقعہ "قران السعدین" کی تخلیق کا سبب بنا۔

جب خسرو نے یہ مثنوی تخلیق کی تو اس وقت وہ کیقباد کے دربار سے وابستہ ہو چکے تھے۔ کیوں کہ وہ حاتم خاں کے ساتھ اودھ میں چھ مہینے سے زیادہ رک نہ سکے اور وطن اور خصوصاً اپنی والدہ کی یاد ستانے لگی تو دہلی واپس آ گئے (۱۸)۔ کیقباد نے ان کو ندیم خاص بنا لیا اور فرمائش کی کہ تم میری اور میرے والد کی ملاقات کا حال اس سحر بیانی سے نظم کرو کہ جب میں والد کو یاد کر کے بے قرار ہو جاؤں تو وہ نظم پڑھ کر سکون حاصل کروں:

گفت چناں بادید اے سحر سنج
کز پے من روئے نہ پیچی ز رنج

جسم سخن را بہ ہنر جان دہی
شرح ملاقات دو سلطان دہی

نظم کنی جملہ بہ سحر زبان
قصہ من باپدر مہربان
تا گرم بجر در آرد زپائے
آیدم از خواندن آں دل بجائے (۱۹)

چناں چہ خسرو نے اس فرمائش کی تعمیل میں ہمہ تن مصروف رہ کر اسے مکمل کر دیا۔ یہ پوری مثنوی "مرقع عیش" ہے، لیکن اس سے اس واقعہ کے تاریخی اور اس زمانے کے تہذیبی و تمدنی حالات سے بھی خوب واقفیت ہوتی ہے۔ اس طرح یہ اس عہد کی تاریخ، تہذیب و ثقافت کا مرقع بھی ہے۔

چوں کہ خسرو نے یہ مثنوی کیقباد کی فرمائش پر لکھی تھی، اور خود بھی حاتم خاں کے ساتھ کیقبادہی کے لشکر میں شامل تھے، اس لیے انھوں نے واقعہ کادراصل ایک ہی رخ دیکھا ہے اور بغرا خاں کی اودھ کی جانب روانگی کو کیقباد کے خلاف فوج کشی سے تعبیر کیا ہے۔ بلکہ "قران السعدین" کی طرح یحیی سرہندی مؤلفہ "تاریخ مبارک شاہی" سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملاقات اس قدر مصالحانہ اور پرامن ماحول میں نہیں ہوئی، جیسا کہ ضیاء الدین برنی، مؤلفہ "تاریخ فیروز شاہی"، فرشتہ، "تاریخ فرشتہ"، عبدالقادر بدایونی "منتخب التواریخ" اور دیگر تاریخوں میں مذکور ہے، بلکہ بغرا خاں لکھنوتی سے دہلی پر فوج کشی کے لیے بھاری لشکر لے کر چلا تھا اور کیقباد اس کی مدافعت کے لیے اودھ پہنچا تھا۔ جب کہ حقیقت اس سے مختلف ہے۔

بغرا خاں کو لکھنوتی کی حکومت بلبن نے عطا کی تھی (۲۰)۔ وہ مستقل

یہیں حکمراں رہا۔ جب کہ بلبن کے انتقال کے بعد دہلی کے تخت پر اس کے بیٹے بغرا خاں کے بجائے اس کا پوتا، یعنی بغرا خاں کا بیٹا، معزالدین کیقباد ۶۸۶ھ / ۱۲۷۹ء میں متمکن ہوا (۲۱)۔ تخت نشینی کے وقت کیقباد کی عمر سترہ اٹھارہ برس تھی۔ جب تک بلبن کے زیر سایہ رہا اس کو لہو و لعب سے دور رکھا گیا۔ لیکن جب تخت پر بیٹھا تو اس کا رنگ ڈھنگ بدل گیا۔ جس دربار کے رعب اور دبدبے کا یہ عالم تھا کہ بڑے سے بڑے امیر کو بھی زبان کھولنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، اب عیش و طرب کا مرکز بن گیا۔ "کوشک لعل" بلبن کی رہائش گاہ تھی، جس نے تخت نشینی کے بعد عیش و نشاط کا عنصر ہی اپنی زندگی سے نکال دیا تھا۔ اس لیے کیقباد کو اب نئے مسکن کی تلاش ہوئی۔ اس نے "کوشک لعل" کی سکونت ترک کر کے دریائے جمنا کے کنارے ایک عالی شان محل میں، جس کا تذکرہ خسرو نے قرانُ السعدین میں بڑی تفصیل سے کیا ہے (۲۲)، جو خاص عیش و نشاط کے مقصد کے لیے تیار کرایا گیا تھا، رہنا شروع کیا۔ قصر شاہی کے چاروں طرف شاہد و ساقی، حسینانِ دل ربا اور مطرب و لطیفہ گو وغیرہ آکر آباد ہو گئے اور بہت جلد ایک نیا شہر وجود میں آ گیا (۲۳)۔ کیقباد کی خواہش تھی کہ اس ہنگامہ، نشاط سے وہ تنہا ہی لطف اندوز نہ ہو بلکہ سب لوگ اس کا ساتھ دیں (۲۴)۔ اس طرز فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرے کا کوئی طبقہ درباری زندگی کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا اور ہر گلی کوچے میں ایک پری پیکر اور ہر گوشہ، بام پر ایک غزل خواں نظر آنے لگا (۲۵)۔ یہاں تک کہ علماء معصیت میں پڑ گئے اور زاہدوں نے عبادت سے ہاتھ کھینچ لیا (۲۶)۔ غرض

وہ سماجی توازن جو بلبن کے عہد میں قایم ہوا تھا، درہم برہم ہوگیا اور بلبنی دربار کا سارا رعب و دبدبہ اور جلال و وقار جاتا رہا۔ ان عیاشیوں اور اپنی کم سنی میں کیقباد کے لیے ناممکن تھا کہ وہ حکمرانی کر سکتا۔ اس کی رنگینیوں اور سرمستیوں کا سارا سامان فراہم کر کے ملک نظام الدین باربک سلطنت کا مختار کل بن بیٹھا (۲۷)۔

بغرا خاں کو بیٹے کی بے راہ روی کی خبریں موصول ہوئیں تو اس کو بڑا دکھ ہوا۔ پہلے تو اس کو شفقت آمیز خطوط لکھ کر بیدار کرنا چاہا، لیکن بیٹے پر ان کا اثر نہ ہوا (۲۸)۔ تجربے کے آئینے میں کیقباد کی تباہی اس کو صاف نظر آرہی تھی اور وہ سمجھ گیا تھا کہ میری عدم موجودگی میں میرے پند و نصائح کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لہذا اس نے طے کیا کہ بیٹے سے ملاقات کرے اور جو کچھ اسے کہنا ہے وہ اس کی موجودگی میں کہے (۲۹)۔ چناں چہ وہ لکھنوتی سے اودھ کی طرف چلا۔ کیوں کہ اس نے کیقباد کو خطوط کے ذریعے ملاقات پر آمادہ کر لیا تھا اور یہ ملاقات اودھ میں ہونا قرار پائی تھی (۳۰)۔ بغرا خاں کا مقصد لشکر کشی نہ تھا۔ لیکن ملک نظام الدین باربک چوکنا ہوا اور کیقباد کی آڑ میں ایک بڑی فوج کے ساتھ دہلی سے اودھ کی سمت بڑھا۔

کیقباد کی فوج کا پہلا پڑاؤ دہلی کے قریب قصبہ سیری میں ہوا (۳۱)۔ لشکر کے میمنہ (دائیں بازو) نے تلپٹ (۳۲) میں خیمے ڈالے۔ لشکر کے میسرہ (بائیں بازو) نے اندپٹ (۳۳) میں قیام کیا۔ لشکر کا قلب جس میں زیادہ تر ہاتھی تھے، اندپٹ اور تلپٹ کے درمیان مقیم ہوا۔ کیقباد نے جو بادلِ ناخواستہ اپنے

عشرت کدے سے نکل کر فوج کے ساتھ چلا تھا، پہلی منزل تلپٹ اور افغان پورہ کے حدود میں کی (۳۴)۔ یہاں اس کو یہ اطلاع ملی کہ مغلوں کی ایک فوج نے شمال مغربی سرحد عبور کی ہے۔ چناں چہ اس نے تیس ہزار سواروں کو ان کے مقابلے کے لیے بھیجا (۳۵)۔ اس کے یہاں قیام کے عرصے ہی میں ایک ہزار مغل قیدی بنا کر اس کے حضور میں پیش کر دیے گئے۔ خسرو نے ان مغلوں کی صورت، شکل اور ہئیت کا بڑی تحقیر کے ساتھ تذکرہ کیا ہے (۳۶)۔ کیقباد یہاں ٹھہر کر آگے بڑھا اور دریائے جمنا پار کر کے جے پور (۳۷) پہنچا (۳۸) نظام الدین باربک یہاں سے ہراول لشکر لے کر آگے بڑھ گیا اور گنگا عبور کر کے دریائے سرجو کے قریب جا پہنچا۔ یہیں کڑہ اور اودھ کے اقطاع دار اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ اس سے آملے (۳۹)۔ دریا کی دوسری جانب بغرا خاں کی فوج تھی۔ اس نے نظام الدین کا لشکر دیکھا تو اس کو غصہ اور اشتعال پیدا ہوا لیکن صبر سے کام لے کر اپنے دبیر شمس الدین (۴۰) کو اس کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ کیا وہ لڑائی کر کے نمک حرامی کا ثبوت دینا چاہتا ہے؟ نظام الدین نے جواب میں کہلا بھیجا کہ وہ اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کر رہا ہے (۴۱)۔ اسی اثنا میں کیقباد بھی باربک کے قریب آ پہنچا۔ اس کا خیمہ گھاگرہ اور سرجو ندیوں کے درمیان لگایا گیا (۴۲)۔ بغرا خاں نے ایک مرتبہ جو کیقباد کو سرجو کے کنارے سیر و تفریح کرتے دیکھا تو محبت پدری میں آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ ایک کشتی میں اس نے حاجب کو بھیجا کہ اس کی طرف سے بیٹے کو شوقِ ملاقات کا پیغام دے۔ جب کشتی دریائے سرجو کے بیچ میں پہنچی تو اس کو تیروں

کا نشانہ بنا کر ڈبو دیا گیا۔ حاجب بمشکل اپنی جان بچا کر بغرا خاں کے پاس
واپس آیا۔ کیقباد کے ساتھی باپ بیٹے کی ملاقات پسند نہ کرتے تھے (۴۳)۔ اس
واقعہ سے بغرا خاں کو بڑا دکھ پہنچا، لیکن اس نے ضبط سے کام لیا اور دوسرے
دن پھر ایک حاجب کو کیقباد کے پاس بھیجا۔ اس طرح باپ بیٹے کے پاس کئی
پیامبروں کی آمدورفت کا سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر دونوں میں ملاقات طے پا گئی
(۴۴)۔ بغرا خاں نے پہلے اپنے چھوٹے بیٹے کیکاؤس کو نادر تحفے، اسلحہ اور ہاتھی
دے کر کیقباد کے پاس بھیجا، جس نے اس کی خاطر و مدارات میں جشن کا
اہتمام کیا (۴۵)۔ پھر کیقباد نے اپنے بیٹے کیومرث کو تحفے و ہدایہ دے کر باپ
کی خدمت میں راونہ کیا۔ دادا نے پوتے کی بڑی آؤ بھگت کی اور جب کیومرث
جانے لگا تو بغرا خاں نے اس کو بھی بہت سے تحائف دیے (۴۶)۔ دوسرے دن
بغرا خاں خود کیقباد سے ملنے گیا۔ بیٹے نے باپ کی آمد میں اپنے دربار کو پورے
تزک و احتشام سے آراستہ کیا۔ جب دونوں ایک دوسرے سے ملے تو بغل گیر ہو
کر دیر تک زار و قطار روتے رہے (۴۷)۔ باپ نے بیٹے کو اصرار کر کے تخت پر
بٹھایا اور دربار کی رسم کے مطابق خود دست بستہ تخت کے سامنے کھڑا رہا۔
لیکن کیقباد فوراً ہی تخت سے اتر آیا۔ تخلیہ میں ایک طویل مباحثہ کے بعد باپ
بیٹے دونوں اس امر پر متفق ہو گئے کہ یہ سب کچھ غلط فہمی کا نتیجہ تھا اور یہ کہ
کیقباد سلطنتِ دہلی کا جائز اور قانونی حکمراں ہے۔ بیٹے نے باپ کی بہت دھوم
دھام سے ایک ضیافت کی۔ جس میں رقص و سرود کا اہتمام بھی کیا گیا تھا (۴۸)
اس موقع پر باپ نے ایک تاج، ایک تخت اور ایک ہاتھی بیٹے کو تحفہ میں دیا

اور بیٹے سے فرمائش کر کے بلبن کی یادگاروں میں سے چتر سپید اور کلاہ سیاہ اپنے لیے لی (۴۹)۔ ایک اور رات پھر دونوں میں ملاقات ہوئی، جس میں باپ نے بیٹے کو رو رو کر بہت سی نصیحتیں کیں (۵۰)۔ وداعی ملاقات کے موقع پر بھی باپ نے کچھ رموزِ حکمرانی بتائے۔ جب رخصت ہونے کا وقت قریب آیا تو دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ جب کیقباد کی نظروں سے بغرا خاں اوجھل ہو گیا تو وہ بے اختیار رونے لگا (۵۱)۔ بغرا خاں نے لکھنوتی کا رخ کیا اور کیقباد دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہ دہلی پہنچا تو کئی دن تک جشنِ شاہانہ منعقد ہوتا رہا (۵۲)۔

محض اس واقعے کو خسرو نے نظم کر کے ایک اہم تاریخی اور ادبی شہ کار کی حیثیت دے دی ہے۔ اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نظم اور لطائفِ نظم کی پابندی کے ساتھ ساتھ تمام تاریخی حیثیتیں ملحوظ رکھی گئی ہیں۔ اس طرح کہ اگر کوئی نثر بھی لکھتا تو اس سے بڑھ کر ان باتوں کو نہ لکھ پاتا (۵۳) بلکہ بغرا خاں اور کیقباد کی ملاقات کو بھی اس مثنوی کی وجہ سے فارسی ادب میں ایک مستقل اہمیت حاصل ہو گئی ہے (۵۴)۔ مؤرخوں نے کیقباد کے عہد کے ذکر میں اس مثنوی کو ایک مستند مآخذ قرار دیا ہے، بلکہ بعض لحاظ سے یہ اس واقعہ اور اسی کے عہد کا تنہا معاصر مآخذ ہے۔ ضیاء الدین برنی نے اپنی "تاریخ فیروز شاہی" میں بغرا خاں اور کیقباد کی ملاقاتوں کی تفصیل "قران السعدین" ہی کو سامنے رکھ کر پیش کی ہے۔ کیوں کہ وہ عہد اس کے بچپن کا تھا اور وہ سن شعور کو نہیں پہنچا تھا (۵۵)۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی "منتخب

التواریخ" میں "قران السعدین" سے استفادہ کیا ہے، اس کا حوالہ بھی دیا ہے اور اس کے اشعار بھی نقل کیے ہیں (۵۶)۔ اسی طرح فرشتہ نے بھی اپنی تاریخ میں باپ بیٹے کی ملاقات کے منظر میں جابجا "قران السعدین" کے کئی اشعار نقل کیے ہیں اور اس کا حوالہ دیا ہے (۵۷)۔ موجودہ دور میں ہنری ایلیٹ اور ڈاؤسن نے اپنی معروف تاریخ کی جلد سوم میں دیگر مستند تاریخوں کی طرح اس مثنوی کے اقتباسات بھی ترجمہ کیے ہیں (۵۸)۔ ای جی کوویل نے اس مثنوی پر ایک سیر حاصل مضمون تحریر کیا ۔ اس کے خیال میں اس مثنوی میں تاریخی واقعات صحت کے ساتھ قلم بند کیے گئے ہیں اور کسی اور زبان کی تاریخی نظموں میں واقعات کی صحیح ترتیب کی ایسی مثال کم ملے گی (۵۹)۔

مثنوی کی ابتدا حمدِ باری تعالیٰ سے ہوتی ہے (۶۰)، پھر نعت اور معراج رسول کا بیان ہے (۶۱) اور اس کے بعد معزالدین کیقباد کی مدح کی گئی ہے (۶۲) پھر خسرو دارالسلطنت دہلی کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہیں ۔ مؤرخوں نے اگرچہ اس مثنوی کے محض اسی حصے کو زیادہ اہمیت دی ہے جس سے بغرا خاں اور کیقباد کی ملاقات کی تفصیل معلوم ہوتی ہے، جب کہ یہ اس سے بھی بڑھ کر تمدنی اور تہذیبی معلومات کا خزینہ ہے ۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کا شہر اس وقت تین حصاروں سے گھرا ہوا تھا ۔ دو پرانے حصار تھے اور ایک نیا (۶۳) نئے حصار سے غالباً کیلوکھری مراد تھا (۶۴)۔ خسرو نے اس نو تعمیر شہر کی جو تفصیلات تحریر کی ہیں وہ اس طرح کسی بھی معاصر تاریخ میں بیان نہیں ہوئی ہیں ۔ یہ شہر اپنی خصوصیات کے اعتبار سے "قبۂ اسلام" کہلاتا تھا (۶۵)۔

یہاں بڑے بڑے بزرگ تھے - ہر گھر اپنی خوبصورتی، سجاوٹ اور آرائش کے اعتبار سے بہشت کا نمونہ تھا اور اس کی صنعت کاریوں میں زرِ کثیر صرف کیا گیا تھا (۶۶)- یہ شہر پہاڑی پر واقع تھا - اس کے اردگرد دو دو میل تک باغ تھے، جن کی آبیاری جمنا سے ہوتی تھی - یہاں سردی اور گرمی دونوں زیادہ پڑتی تھیں پھول سال کے ہر موسم میں نظر آتے تھے، پھولوں سے چمن چاندی اور سونے کی طرح جگمگاتا رہتا تھا - روئے زمین پر سبزوں کی لہلہاہٹ سے سوادِ بہشت کا لطف آتا تھا (۶۷)- ہند اور خراسان کے میووں سے بازار بھرے رہتے تھے - عام طور پر لوگ فرشتہ صفت ہوتے تھے، وہ صنعت، علم، ادب اور موسیقی سے لگاؤ رکھتے تھے اور فن سپہ گری کے بھی ماہر ہوتے تھے (۶۸)- شہر میں جامع مسجد، منارہ اور حوضِ سلطانی خاص طور پر نمایاں تھے - مسجد میں نو گنبد تھے (۶۹)- منارہ فلک شگاف تھا - اس کے اوپر ایک قبہ تھا جس کا بالائی حصہ سونے کا تھا (۷۰)- حوضِ سلطانی دو پہاڑوں کے درمیان واقع تھا - چوں کہ پہاڑی زمین تھی، اس لیے اس کا پانی زمین میں جذب نہیں ہوتا تھا اور اس قدر صاف اور شفاف تھا کہ رات کے وقت بھی اس کی تہہ نظر آتی تھی - شہر میں لوگ اس کا پانی پیتے تھے - دریائے جمنا سے حوض تک بہت سی نہریں نکالی گئی تھیں - اس کے بیچ میں چبوترہ بنا ہوا تھا، جس پر ایک عمارت بھی تھی - حوض کے مرغ و ماہی کے سبب بڑا دل کش منظر رہتا تھا - اس لیے شہر کے لوگ یہاں تفریح کے لیے جاتے تھے (۷۱)- جمنا کے کنارے کیلوکھری میں شاہی محل واقع تھا، جو آراستہ ہونے کی وجہ سے مثلِ بہشت تھا - اس کا عکس دریا میں پڑتا

تھا۔ اس کے ایک طرف دریا تھا تو دوسری طرف باغ تھا، جس کے درختوں کی شاخیں محل کے اندر آکر لٹکتی رہتی تھیں (۲)۔ موسمِ بہار اور موسمِ خزاں میں ان باغوں میں جو عالم طاری رہتا تھا، خسرو نے اس کی بھی سحر انگیز مصوری کی ہے (۳)۔ کیقباد نے اپنے محل میں جس طرح جشن نوروزی منایا تھا، خسرو نے بڑے لطف و سرور کے ساتھ اس کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ اس سے شاہی دربار کے تمدن کا اندازہ ہوتا ہے (۴)۔ اسی طرح سے جب کیقباد نے باپ کے ملاقات کے موقع پر جو بڑی شاندار دعوت دی تھی، خسرو نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس کی جزئیات بھی تحریر کی ہیں۔ ان سے اس زمانے کے شاہی دسترخوان کے لوازمات اور آداب کی تفصیلات معلوم ہوتی ہیں (۵)۔ اس کے بعد باپ بیٹوں میں جن جن تحائف اور نذرانوں کا تبادلہ ہوا، خسرو نے انھیں علیحدہ علیحدہ بیان کیا ہے (۶)۔

حواشی :

(۱) امیر خسرو "قران السعدین" (مطبع حسنی لکھنو، ۱۲۶۱ھ) ص ۱۸۰۔

(۲) ڈاکٹر وحید مرزا کے خیال کے بموجب جب ان کی عمر اس وقت چالیس سال تھی۔ "Life and Works of Amir Khusrau" (لاہور ، ۱۹۶۲ء) ص ۱۲۴۔
مولانا اسمٰعیل میرٹھی نے اس وقت خسرو کی عمر پچاس سال تحریر کی ہے۔ مقدمہ "قران السعدین" (مطبوعہ علی گڑھ ۔ ۱۹۱۸ء)، ص ۲۸۔

(۳) "قران السعدین" ص ۱۸۸، زیر نظر مقالے میں "قران السعدین" کا جہاں بھی حوالہ دیا جارہا ہے وہ مطبع حسنی، لکھنو، ۱۲۶۱ء کے مطابق ہے۔

(۴) ایضاً، ص ۱۸۰

(۵) "قران السعدین" ص ۱۸۸

(۶) بقول سید حسن برنی، یہ مثنوی فارسی ادب میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ وہ اپنے رنگ میں بالکل انوکھی ہے۔ اس مثنوی کے لیے خسرو کے سامنے کوئی نمونہ موجود نہیں تھا اور نہ اس کے بعد اس کا کوئی جواب لکھا گیا ...... تمہید "قران السعدین" (علی گڑھ، ۱۹۱۸ء) ص ۷۔

(۷) صباح الدین عبدالرحمن "بزم مملوکیہ" (اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء) ص ۳۳۲

(۸) اس کے ادبی اور فنی محاسن کے جائزے کے لیے: ایضاً، ص ۳۴۰۔۳۴۹؛ اسمٰعیل میرٹھی مقدمہ، سید حسن برنی، تمہید "قران السعدین" (علی گڑھ، ۱۹۱۸ء)

(۹) ضیاء الدین برنی "تاریخ فیروز شاہی" اردو ترجمہ (لاہور، ۱۹۶۹ء) ص ۱۹۵۔

(۱۰) خسرو "دیباچہ دیوان غرۃ الکمال" (دہلی، بار اول)، ص ۷۰۔

(۱۱) ایضاً، ص ۷۱

(۱۲) ایضاً، ص ۷۲

(۱۳) خسرو "دیباچہ دیوان غرۃ الکمال" ص ۷۳

(۱۴) ایضاً

(۱۵) برنی، ص ۲۲۱

(۱۶) خسرو "دیباچہ غرۃ الکمال"، ص ۷۴

(۱۷) ایضاً۔

(۱۸) خسرو "قران السعدین"، ص ۱۶۸-۱۶۹

(۱۹) ایضاً، ص ۱۷۰

(۲۰) برنی، ص ۱۶۶

(۲۱) برنی نے ۶۸۵ھ لکھا ہے۔ ص ۲۱۵، جو درست نہیں۔ عصامی "فتوح السلاطین" (آگرہ، ۱۹۱۸ء) ص ۱۸۰؛ یحیی سرہندی "تاریخ مبارک شاہی" (کلکتہ، ۱۹۳۱ء) ص ۵۲؛ اور "قران السعدین" میں خسرو کے اس شعر سے اس کی تائید ہوتی ہے:

گرد چو در شش صد و ہشتاد و شش
بر سر خود تاج جد خویش خوش

(۲۲) ص ۴۲-۴۵ وبعدہ۔

(۲۳) برنی، ص ۲۱۹

(۲۴) ایضاً، ص ۲۶۶

(۲۵) ایضاً، ص ۲۱۸

(۲۶) خلیق احمد نظامی "سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات" (دہلی، ۱۹۵۸ء)، ص ۱۸۹، و نیزان اثرات کا ایک اچھا تجزیہ .... یہی مصنف

"Some Aspects of Religion and Politics in India, During the Thirteenth Century"

(لندن، ۱۹۶۱ء) ص ۱۴۴-۱۴۷ وبعدہ میں ہے۔

(۲۷) برنی، ص ۲۲۱

(۲۸) ایضاً، ص ۲۳۰

(۲۹) ایضاً، ص ۲۳۱

(۳۰) ایضاً، ص ۲۳۲

(۳۱) خسرو "قران السعدین" ص ۶۸۔

(۳۲) دہلی سے پانچ چھ کوس پر اس کا مشہور پرگنہ۔

(۳۳) نواحِ دہلی کا ایک قصبہ۔

(۳۴) خسرو "قران السعدین" ص ۶۸۔

(۳۵) خسرو "قران السعدین" ص ۲۹۔

(۳۶) ایضاً، ص ۷۱۔۳۔

(۳۷) ضلع بلند شہر کے مضافات کا ایک قصبہ۔

(۳۸) خسرو "قران السعدین" ص ۷۷۔

(۳۹) ایضاً، ص ۷۷۔۸۔

(۴۰) شمس الدین دبیر اس دور کی ایک بلند پایہ علمی اور ادبی شخصیت بھی شمار ہوتے ہیں۔ بعض مصنفین کی جانب سے ان کا ذکر امیر خسرو کے استاد کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ جیسے عبدالقادر بدایونی "منتخب التواریخ" اردو ترجمہ (لاہور، ۱۹۶۳ء) ص ۷۷؛ اس موضوع پر راقم الحروف کا مضمون "اساتذہ خسرو" مفصل ہے۔ ان کا وطن سنام تھا، فرشتہ "تاریخ فرشتہ" جلد دوم، اردو ترجمہ (لکھنو، ۱۹۳۳ء) ص ۳۸۹۔ ان کی علمی استعداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ہر قسم کے علوم حاصل کیے تھے۔ علم سلوک پر قاضی حمید الدین ناگوری کی کتاب "لوائح" بابا فرید گنج شکر سے پڑھی تھی۔ حسن سجزی "فوائد الفواد" اردو ترجمہ (لاہور، ۱۹۷۳ء) ص ۲۶۸۔۳۱۹۔ مولانا سید عبدالحیٔ نے ان کا شمار ممتاز علماء اور شعرا میں کیا ہے۔ "نزہتہ الخواطر" اردو ترجمہ، جلد دوم (لاہور، ۱۹۶۵ء) ص ۸۲۔ سلاطینِ دہلی کے دربار سے وابستہ ہوئے تو دبیر کے فرائض انجام دیتے رہے۔

(۴۱) خسرو "قران السعدین" ص ۷۸۔۸۰

(۴۲) ایضاً، ص ۸۵

(۴۳) ایضاً، ص ۸۶

(۴۴) ایضاً، ص ۸۷۔۱۰۲

(۴۵) ایضاً، ص ۱۰۲۔۱۰۴

(۴۶) ایضاً، ص ۱۰۴۔۱۰۹

(۴۷) ایضاً، ص ۱۱۳۔

(۴۸) ایضاً، ص ۱۲۰۔۱۴۲

(۴۹) ایضاً، ص ۱۴۲۔۱۵۱

(۵۰) ایضاً، ص ۱۵۲-۱۵۹؛ انھیں برنی ص ۲۳۶-۲۵۱ میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ آخر میں بغرا خاں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اب تک اس کے خلاف بغاوت نہ ہونے کا سبب صرف بلبن کا رعب ہے، ورنہ عیش و طرب کا ماحول کب کسی بادشاہ کو تخت پر رہنے دیتا ہے۔ ایضاً، ص ۲۴۸-۲۴۹

(۵۱) خسرو "قران السعدین" ص ۱۹۰-۱۹۳۔

(۵۲) ایضاً، ص ۱۷۵-۱۷۸؛ ابتدا سے یہاں تک واقعات قدرے اختلاف کے ساتھ برنی نے بھی تحریر کیے ہیں، ص ۲۳۳-۲۶۲؛ و نیز صباح الدین عبدالرحمن، تصنیف مذکور، ص ۳۲۴-۳۲۶ پی ہارڈی، "Historians of Medieval India" (لندن ، ۱۹۶۰ء) ص ۷۱-۷۶؛ اسمٰعیل میرٹھی، مقدمہ۔ تصنیف مذکور۔

(۵۳) شبلی "شعر العجم" جلد دوم (لاہور، ۱۹۴۶ء) ص ۱۲۰۔

(۵۴) ڈاکٹر معین الحق، مقدمہ "تاریخ فیروز شاہی"، ضیاء الدین برنی (لاہور، ۱۹۶۹ء) ص ۲۷

(۵۵) "قران السعدین" ۶۸۸ھ میں مکمل ہوئی تھی۔ بغرا خاں اور کیقباد کی ملاقات یکم رجب ۶۸۷ھ سے قبل ہوئی تھی۔ کیوں کہ خسرو نے اس تاریخ کو اپنے دوست حسن سجزی کو ایک خط لکھا تھا، جو اس وقت دہلی میں تھے۔ خسرو نے انھیں یہ خط اس وقت لکھا تھا، جب بغرا خاں لکھنوتی اور کیقباد دہلی کو روانہ ہو رہے تھے۔ کیقباد نے خسرو کے آقا حاتم خاں کو اودھ کا اقطاع عطا کیا تھا۔ برنی، ص ۲۸۵، چناں چہ خسرو کو وہیں قیام کرنا پڑا۔ انھوں نے اپنے اس خط میں دہلی نہ پہنچ سکنے کے غم اور ملال کو تحریر کیا ہے۔ اس میں مختصر طور پر باپ، بیٹوں کی ملاقات کا تذکرہ بھی ملتا ہے (اس خط کے مندرجات اور اس کی اہمیت کے لیے راقم الحروف کا مقالہ بعنوان "اعجاز خسروی کا تاریخی پہلو"۔ ۶۸۷ھ میں ضیاء الدین برنی کی عمر تین یا چار سال تھی۔ تفصیلات کے لیے ڈاکٹر مسز افسر سلیم خاں، مقدمہ "فتاویٰ جہانداری" مصنفہ، ضیاء الدین برنی (لاہور، ۱۹۷۲ء)، ص ۱۷۔

(۵۶) ص ۸۴

(۵۷) جلد اول، ص ۱۳۸-۱۴۱

(۵۸) "History of India as told by its own Historians" (لندن ، ۱۸۶۸ء) ص ۵۲۴-۵۳۴۔

(۵۹) "The Kiranus Sadain of Mir Khusrue" منقول "Journal of the Asiatic Society of Bengal" جلد ۳۹، ۱۹۰۶ء ص ۲۲۷-۲۲۸

(۶۰) خسرو "قران السعدین" ص ۲-۹۔

(۶۱) ایضاً، ص ۹-۱۷

(۶۲) ایضاً، ص ۱۷-۲۲

(۶۳) ایضاً، ص ۲۲

(۶۴) سید حسن برنی، تصنیف مذکور ص ۴۱؛ اسے خود کیقباد نے تعمیر کرایا تھا۔ برنی، ص ۲۱۸-۲۱۹۔

(۶۵) خسرو "قران السعدین" ص ۲۳۔

(۶۶) ایضاً۔

(۶۷) ایضاً، ص ۶۶-۲۷

(۶۸) ایضاً، ص ۶۶-۲۷

(۶۹) ایضاً، ص ۲۴

(۷۰) ایضاً۔

(۷۱) ایضاً، ص ۲۶

(۷۲) ایضاً، ص ۴۲-۴۵

(۷۳) ایضاً، ص ۔ ۴۵-۵۷

(۷۴) ایضاً، ص ۔ ۵۶-۶۷

(۷۵) ایضاً، ص ۔ ۱۲۱-۱۴۲

(۷۶) ایضاً، ص ۱۴۲-۱۴۷؛ ان تمام موضوعات کو بالتفصیل صباح الدین عبدالرحمن، تصنیف مذکور، ص ۳۳۶-۳۳۹ میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ اسی لیے یہاں ان کے تذکرے سے احتراز کیا گیا ہے۔

فہرست اسناد محولہ

اشاریہ

فہرستِ اسنادِ محولہ

اختر جوناگڑھی، "مقالاتِ اختر" (کراچی ۱۹۷۲ء)

ایلیٹ، ہنری اور ڈاؤسن، اے "History of India. As Told by its

"History of India As Told by its — جلد سوم

(لندن، ۱۸۶۸ء)

برنی، ضیاء الدین، "تاریخ فیروز شاہی" اردو ترجمہ: ڈاکٹر سید معین الحق، (لاہور، ۱۹۶۹ء)

ـــــــــ "فتاویٰ جہاں داری" مرتبہ: افسر سلیم خاں، (لاہور، ۱۹۷۲ء)

پرشاد، ایشوری "History of Medieval India" (الہ آباد، ۱۹۳۳ء)

تھامسن، ایڈورڈ "The Chronicles of the Pathan Kings of Delhi" (لاہور، ۱۹۷۵ء)

جمالی، جلال الدین "سیر العارفین" اردو ترجمہ: ڈاکٹر محمد ایوب قادری، (لاہور، ۱۹۷۵ء)

حبیب اللہ - اے - بی - ایم "Foundation of Muslim Rule in India" (لاہور، ۱۹۴۵ء)

حسن سجزی، امیر "فوائد الفواد" اردو ترجمہ (لاہور، ۱۹۷۳ء)

حسن عسکری، سید "Material of Historical Interest in Medieval India. : مشمولہ "Aijaz-e-Khusravi A Miscellany." Vol-I (علی گڑھ، ۱۹۶۹ء)

خسرو، امیر "آئینہ سکندری" (دہلی، بار اول)

ـــــــــ "اعجاز خسروی" (لکھنو، ۱۸۷۶ء)

ـــــــــــــ "خزائین الفتوح" (علی گڑھ، ۱۹۲۷ء)

ـــــــــــــ "دول رانی خضر خاں" (علی گڑھ، ۱۹۱۸ء)

ـــــــــــــ "دیباچہ غرۃ الکمال" (دہلی، باراول)

ـــــــــــــ "قران السعدین" (لکھنو، ۱۲۶۱ء)

ـــــــــــــ "قران السعدین" مرتبہ: سید حسن برنی، مقدمہ: اسمٰعیل میرٹھی
(علی گڑھ، ۱۹۱۸ء)

ـــــــــــــ "کلیاتِ خسرو" (تہران، ۱۳۴۶ف)

ـــــــــــــ "مثنوی ہشت بہشت" (علی گڑھ، ۱۹۱۸ء)

ـــــــــــــ "مجنوں و لیلیٰ" (ماسکو، ۱۹۶۵ء)

ـــــــــــــ "مطلع الانوار" (علی گڑھ، ۱۹۲۶ء)

ـــــــــــــ "نہ سپہر" مرتبہ: وحید مرزا (کلکتہ، ۱۹۴۹ء)

دارا شکوہ "سفینۃ الاولیا" اردو ترجمہ: غلام دستگیر نامی، (لاہور، باراول)

دولت شاہ سمرقندی "تذکرہ شعراء" قلمی، مملوکہ: معین الدین عقیل

سعید مارہروی، احمد "حیاتِ خسرو" (دہلی، ۱۹۱۲ء)

شبلی نعمانی "شعر العجم" جلد دوم۔ (لاہور، ۱۹۴۶ء)

صباح الدین عبدالرحمن "بزم صوفیہ" (اعظم گڑھ، ۱۹۴۹ء)

ـــــــــــــ "بزم مملوکیہ" (اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء)

ـــــــــــــ "شہاب الدین مہمرہ۔ استاد امیر خسرو" مشمولہ: "معارف"
(اعظم گڑھ، اکتوبر ۱۹۵۲ء)

ـــــــــــــ "ہندوستان، امیر خسرو کی نظر میں" (اعظم گڑھ، ۱۹۶۶ء)

عبدالحق، شیخ، محدث دہلوی "۔ "انوار صوفیہ" اردو ترجمہ، "اخبار الاخیار"
(لاہور، ۱۹۶۷ء)

عبدالحی ، سید " نزہتہ الخواطر " اردو ترجمہ : امام خاں نوشہروی، جلد اول . جد ۰۰
(لاہور، ۱۹۶۵ء)

عبدالقادر بدایونی " منتخب التواریخ " اردو ترجمہ (لاہور، ۱۹۶۲ء)

عصامی " فتوح السلاطین " (آگرہ، ۱۹۸۳ء)

فرشتہ ، محمد قاسم ہندوشاہ " تاریخ فرشتہ " اردو ترجمہ : " جلد اول ودوم " (لکھنو، ۱۹۳۱ء)

کویل، ای - جی "The Kiranus Sa'dain of Amir Khusrau"
مشمولہ : "Journal of the Asiatic Society
of Bengal" جلد ۳۹-۱۹۰۶ء

لال، کے - ایس - "History of the Khiljis" (لندن، ۱۹۶۷ء)

لین پول، اسٹینلے "Medieval India" (لندن، ۱۹۱۷ء)

مہاجن، وی - ڈی "The Muslim Rule in India" (دہلی، ۱۹۶۲ء)

نظامی بدایونی " قاموس المشاہیر " جلد دوم (بدایوں، ۱۹۳۶ء)

نظامی، خلیق احمد " سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات "
------- "Some Aspects of Religion and Politics
in India During the 13th Century" (لندن، ۱۹۶۱ء)

وحید مرزا، ڈاکٹر " امیر خسرو " (الہ آباد، ۱۹۴۹ء)
------- "Life and Works of Amir Kusrau"
(لاہور، ۱۹۶۲ء)

ہارڈی - پی - "Historians of Medieval India"
(لندن، ۱۹۶۰ء)

یحییٰ سرہندی " تاریخ مبارک شاہی " (کلکتہ، ۱۹۳۱ء)

اشاریہ

اسی مصنف کی چند مطبوعات

تصنیفات:

پاکستانی غزل: تشکیلی دور کے رویے اور رجحانات (کراچی)
نوادراتِ ادب، (لاہور)
پاکستان میں اردو ادب، محرکات اور رجحانات کا تشکیلی دور (کراچی)
اقبال اور جدید دنیاے اسلام؛ مسائل، افکار اور تحریکات (لاہور)
تحریکِ آزادی میں اردو کا حصہ (کراچی)
پاکستان میں اردو تحقیق، موضوعات اور معیار (کراچی)
پاکستان میں اردو غزل [رانچی (بھارت)]
سلطنتِ بہمنیہ اور ایران کے علمی و تمدنی روابط (کراچی)
تحریکِ آزادی اور مملکتِ حیدر آباد (کراچی)
تحریکِ پاکستان کا تعلیمی پس منظر (لاہور)
مسلمانوں کی جدو جہد آزادی؛ مسائل، افکار اور تحریکات (لاہور)
تحریکِ پاکستان اور مولانا مودودی (کراچی)

تالیفات

کلامِ رنجور: رنجور عظیم آبادی کے کلام کی اولین اشاعت (پٹنہ، بھارت)
بیتی کہانی: اردو کی اولین نسوانی خود نوشت (حیدر آباد، سندھ)
مدح و قدحِ دکن: ادب و شعر میں تاریخ و تمدن دکن کی جھلکیاں (کراچی)
دکن کا عہدِ اسلامی: ایک منتخب کتابیات (کراچی)
کلامِ نیرنگ: میر غلام بھیک نیرنگ اور ان کا کلام (کراچی)
ایک نادر سفرنامہ: دکن کے اہم مقامات کے احوال و کوائف (کراچی)
اشاریہ، کلامِ فیض: (کراچی و دہلی)
ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ایک کتابیات (اسلام آباد)
"منتخبات اخبار اردو" (اسلام آباد)
"منتخبات اردو نامہ" (اسلام آباد)

فرد اور تاریخ

معین الدین عقیل